تربیت کے اسلوب

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر

مترجم: نصیر الرضا صفدر

No. 10091 ...... Date 10/8/10
Section ...... Status ......
D.D. Class ......
NAJAFI BOOK LIBRARY

تربیت کے اسلوب

مُصنّف
شہید ڈاکٹر جواد باہُنر

مترجم
نصیر الرضا صفدر

ناشر
امامیہ پبلی کیشنز پاکستان
35 - حیدر روڈ ○ اسلام پورہ ○ لاہور۔ فون : 7119027

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب ---------- تربیت کے اسلوب

مصنف ---------- ڈاکٹر شہید جواد باہنر

مترجم ---------- نصیر الرضا صفدر

کمپوزنگ ---------- نثار حسین بلتستانی

مطبع ---------- معراج دین پرنٹرز

بار اول ---------- مارچ ۱۹۹۸ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ملنے کا پتہ

العصر اسلامک بک سنٹر

۳۵- حیدر روڈ لاہور- فون ۷۲۴۸۶۴۲

Nasir Abbas Nayani

فہرست مطالب

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۹	مقدمہ از قلم صدر جمہوری اسلامی ایران	۱
۱۵	پیش گفتار	۲

فصل اول

۱۹	مقائیسہ انسان از دیدگاہ اسلامی و مسیحیت	۳
۲۱	انسان سازی	۴
۲۲	قرون وسطیٰ کا دور	۵
۲۳	فکر کی پریشانی کا دور	۶
۲۴	قرون وسطیٰ کی مسیحیت میں "خدا اور انسان"	۷
۲۸	اس طرز فکر کا انسان سازی کے دور کی پیدائش پر تاثر	۸
۲۸	اسلامی نقطہ نظر سے خدا اور انسان کا تعلق	۹
۳۴	گزشتہ بحث کا نتیجہ	۱۰
۳۵	اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی شناخت	۱۱
۳۶	اس بحث سے متعلق آیات قرآنیہ کے عناوین	۱۲
۳۹	اس بحث سے متعلق روایات کے عناوین	۱۳

فصل دوم

۴۱	قرآنی نقطہ نظر میں انسان	۱۴
۴۳	خلافت انسان	۱۵
۴۶	تسخیر و تصرف	۱۶

۱۷ انسان میں جذبہ الٰہی و ملکوتی ۴۸
۱۸ انسان میں بعد الٰہی اور مادیت کا جذبہ ۴۹
۱۹ انسان کی زندگی کے اہداف اور مقاصد ۵۳
۲۰ فطرت انسان ۵۹
۲۱ علم و آگہی پر قدرت ۶۲
۲۲ راستہ کے انتخاب میں آزاد اور خود مختار ہے ۶۴

فصل سوم

۲۳ اسلام میں اصول تعلیم و تربیت ۷۳
۲۴ انسان کی آگاہی کی قدرت اور اس کی تربیت کے اصول ۷۵
۲۵ علم دوستی کی ضرورت ۷۶
۲۶ فکر کرنے کی صحیح روش ۷۷
۲۷ فکر کے اقسام اور نواحی ۷۸
۲۸ طبعیت شناسی ۷۸
۲۹ خود شناسی ۷۸
۳۰ تاریخ شناسی اور جامعہ شناسی ۷۹
۳۱ وحی کی شناخت اور اسے حاصل کرنا ۸۰
۳۲ فکر و اندیشہ کی آفت ۸۰
۳۳ اندھی تقلید ۸۱
۳۴ طاغوت کی پیروی ۸۲
۳۵ بزرگوں کی اندھی تقلید ۸۳
۳۶ ہوائے نفس کی پیروی ۸۴

۳۷ گمان کی پیروی ۸۵

۳۸ بصیرت ۸۸

۳۹ انسان کے انتخاب کی قدرت اور اس کی تربیت کے اصول ۹۰

۴۰ تقویت ارادہ ۹۳

۴۱ ارادہ کے تباہ کرنے والی آفات سے مبارزہ ۹۴

۴۲ ہوائے نفس کے خلاف مبارزہ ۹۵

۴۳ ناتوانی اور بناوٹ سے اجتناب کیا جائے ۹۶

۴۴ راحت طلبی اور سستی کے ساتھ مبارزہ ۹۷

۴۵ حق کو قبول کرنا ہی تربیت کا ماحصل ہے ۹۸

۴۶ واقعیات کے بیان کرنے میں مغالطہ ۱۰۲

۴۷ حق کی عمومیت ۱۰۳

۴۸ دینی اور آئیڈیلزم (تصورات ذہنی) اعتقادات ۱۰۴

۴۹ آئیڈیلزم میں موہوم اور ہدف کے درمیان تفاوت ۱۰۶

۵۰ حقائق تک پہنچنے کے لئے علمی آگاہی ۱۰۸

۵۱ حق کو قبول کرنے کے تربیتی نتائج ۱۰۹

۵۲ تفاوت سفسطہ و استدلال ۱۰۹

۵۳ واقع بینی میں گسترش ۱۱۱

فصل چہارم

۵۴ بیوی اور شوہر کے آپس میں روابط ۱۱۳

۵۵ شادی اور اسلام ۱۱۶

۵۶ سکون، مودت، راحت ۱۱۶

۵۷	دو زندگیوں کا معاملہ	۱۱۷
۵۸	میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے لباس ہیں	۱۱۸
۵۹	میاں بیوی کی مشترک خلقت کا سرچشمہ کیا ہے	۱۱۹
۶۰	حق مہر محبت کی علامت ہے	۱۲۰
۶۱	پانچ عدد نصیحتیں	۱۲۱
۶۲	عورت اور مرد ایک دوسرے کے کام کو پیش نظر لائیں	۲۲۲
۶۳	مالی مسائل کی طرف توجہ ہو	۱۲۵
۶۴	دوستوں' رشتہ داروں سے اعتدال سے پیش آئیں	۱۲۹
۶۵	جنسی کے معاملات	۱۳۱
۶۶	شادی کے بعد ---- خواہشیں اور خواب	۱۳۱
۶۷	جماع کا رابطہ	۱۳۳
۶۸	ایک دوسرے کی دینی اور اجتماعی مسئولیت کو اہمیت دینا	۱۳۵

فصل پنجم

۶۹	صمیمت فرزندان و اولیا	۱۳۹
۷۰	پہلا سوال	۱۴۲
۷۱	دوسرا سوال	۱۴۳
۷۲	تیسرا سوال	۱۴۳
۷۳	نسلوں کا فرہنگی اختلاف	۱۴۳
۷۴	اصول صمیمیت	۱۴۶
۷۵	گھر میں صمیمیت ایجاد کرنے کے ذرائع	۱۴۸
۷۶	ماں اور باپ کے درمیان صمیمیت	۱۴۹

۷۷	ہوشیاری، دقت اور حسابگری	۱۵۱
۷۸	اخلاق اور تربیت کی حامل شخصیت	۱۵۲
۷۹	بچوں کی غلطی پر مناسب رویہ اختیار کرنا	۱۵۴
۸۰	بچوں کی اچھی کارکردگی کو اہمیت دینا	۱۵۶
۸۱	بحث اور گفتگو کے لئے صمیمانہ ماحول کی فراہمی	۱۵۷
۸۲	گھریلو امور میں بچوں سے ان کی رائے طلب کرنا	۱۵۸
۸۳	ہمکاری و تقسیم مسئولیہ	۱۵۹
۸۴	بچوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کریں	۱۶۰
۸۵	اپنے خانوادہ کے افراد کے درمیان جہاں بینی کی فکر پیدا کریں	۱۶۲

فصل ششم

۸۶	گھر اور تعلیمی اداروں میں ہمکاری	۱۶۵
۸۷	بچے کی تربیت میں وراثت کا اثر	۱۶۷
۸۸	ارادی اور غیر ارادی تربیت	۱۷۰
۸۹	نقش منزل	۱۷۲
۹۰	گھر اور مدرسہ میں بچے کی تربیت کے اصول	۱۷۴
۹۱	مار پیٹ سے پرہیز کیا جائے	۱۷۴
۹۲	گالی، گلوچ سے پرہیز کیا جائے	۱۷۴
۹۳	اختلاف پھیلانے سے پرہیز کریں	۱۷۵
۹۴	سفر اور مہمان نوازی کے بارے میں چند نکات	۱۷۷
۹۵	بے مقصد گفتگو	۱۷۷
۹۶	بڑے بننے کے لئے سبقت لے جانا	۱۷۸

۹۷ برے لوگوں کی طرف آمد و رفت ۱۷۹
۹۸ کتاب ہی مناسب عیدی ہے ۱۷۹
۹۹ جہاں جانا ہے اس جگہ کا انتخاب ۱۸۰
۱۰۰ خلاصہ بحث ۱۸۲

فصل ہفتم

۱۰۱ مسئلہ تعلیم و تربیت در اسلام ۱۸۳
۱۰۲ تعلیم سے پہلے تزکیہ ۱۸۸
۱۰۳ رابطہ تزکیہ و تربیت ۱۸۹
۱۰۴ پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کا شعار ۱۹۰
۱۰۵ ایک اور شاہد ۱۹۱
۱۰۶ انسان کی خیر خواہی اور کمال طلبی میں تزکیہ کا اثر ۱۹۳
۱۰۷ معاشرے میں فسادات کا اثر ۱۹۴
۱۰۸ جھوٹ ایک آفت ہے ۱۹۴
۱۰۹ نوجوانوں کی پسماندگی میں فسادات کا اثر ۱۹۶
۱۱۰ صنعتی ترقی یافتہ ممالک میں اخلاقی فسادات کی تخریب کاریوں کا اثر ۱۹۷
۱۱۱ رسالت کے اہداف میں سے ایک ۱۹۹
۱۱۲ نئی چیزیں جنہیں اسلام نے بیان کیا ہے ۲۰۰
۱۱۳ نوجوانوں کی تربیت میں حساس اثر ۲۰۲

مقدمہ

از قلم :۔ سابق صدر جمہوری اسلامی ایران
حضرت حجتہ الاسلام والمسلمین علی اکبر ہاشمی رفسنجانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

شہید دانشمند ڈاکٹر محمد جواد باہنر(قدہ) کے علمی آثار کی جمع آوری اور ان کی نشرو اشاعت نہایت مسرت اور شادمانی کا باعث ہے۔ اور یہ قدم معاشرہ کے لئے انقلاب اسلامی کے لئے اور اسلام کے لئے نہایت مفید اور مؤثر ہے۔

اس کام پر مجھ سے بڑھ کر شاید ہی کسی کو خوشی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ اس شہید وزیر اعظم کو جتنا میں جانتا ہوں ----- شاید کوئی بھی اسے اتنا نہ جانتا ہو 'ور اگر جانتے بھی ہوں گے تو مجھ سے کم جانتے ہوں گے۔ اسی وجہ سے ----- ان کی شہادت کا جتنا مجھے دکھ ہوا ہے ----- اس میں اپنے آپ کو تنہا سمجھتا ہوں۔ میں اور شہید ڈاکٹر باہنر تقریباً" تیس سال تک قریبی دوست' ہمراہی' ہم زمان' ہم دل اور ہمکار کی حیثیت سے رہے ہیں۔ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کی ہمراہی میں کام کیا ہے۔ اور ان کے کاموں میں ان کے ساتھ شریک اور مانوس رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کبھی کوئی چیز نہ چھپائی۔ اسی خاطر میں یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ان کی شہادت کے غم میں مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔

ہماری آپس میں دوستی اور ہمکاری اس دن سے شروع ہوئی جب ہم دونوں سن ۳۰ --- ۴۰ میں حوزہ علمیہ قم میں وارد ہوئے۔ اور ہم نے دینی تعلیم کا آغاز کیا۔ اس

دن سے لیکر ۸ شہریور سنہ ۶۰ شمسی تک جاری و ساری رہی اور یہ ان کی زندگی کا آخری دن تھا۔ ان حالات میں کبھی بھی کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ نہ ہوا۔ خدا جانتا ہے کہ اس مدت مدید میں میری ان کے ساتھ دوستی، رفاقت، تعلق اور عقیدت کس قدر رہی۔ اس لئے کہ جب بھی کوئی آزمائش آن پڑتی تو میرے سامنے کتاب کے تازہ صفحہ کی طرح ابھر کر آتے جسے پڑھنے میں تازہ جاذبیت ہوتی۔

ہمارے شہید وزیر اعظم میں وہ تمام صفات اور خصوصیات پائی جاتی تھیں جو ایک آگاہ اور متعہد مسلمان شخص میں ہونی چاہیں ایمان، خلوص، نجابت، اصالت، دانش، انکا قلم، انکا قدم، ادب، ہنر، جہاد، جذبہ ایثار، عبادت، شہامت، رشد اور کام کرنے کی صلاحیت، استقامت، راز داری، محبت، صمیمیت، صفا، وفا، خوشی، امید، ولایت، عرفان ------- اصول اخلاق و آداب، علوم دینی اور ہنرمندی، انسانی و اسلامی عمل ان کے وجود کے اندر سمندر کی لہروں کی طرح موج زن تھے میں نے ان کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کیا ہے اور خدا کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ذرہ بھر کمزوری یا ناتوانی کو محسوس نہیں کیا مثلاً"

مدرسہ کی کلاس میں،

مباحثہ کے دوران،

مکتب تشیع کی نشر و اشاعت میں،

وہ ہماری زندگی جو ہم نے حوزہ علمیہ قم کے حجرات میں درس و تدریس کے دوران گزاری،

روحانیت کے بیس سالہ مبارزہ میں،

رفاہ عامہ کے کاموں میں،

کتابوں، درسی و اجتماعی و اسلامی نوٹس کے تحریر کرنے میں،
ہفتہ وار دروس کے اجرا میں
مبازرہ کے دوران زندان میں کی جانے والی تقریروں میں،
اشتہارات اور شبناموں کے لکھنے میں،
بعثت، انتقام کی مخفی نشریات میں،
خانوادگی مشکلات میں،
شخصی زندگی کی مشکلات میں،
زندگی کے وسائل کو مہیا کرنے میں،
مبارزہ آرائی کے جلوسوں میں،
سیاسی، اجتماعی اور خصوصی سفروں میں،
مختلف قسم کی ہیئتوں کی تشکیل میں،
روحانیت مبارز کے ادارہ کرنے میں،
حزب جمہوری کی تاسیس میں،
حزب جمہوری کے مواضع اور شوریٰ انقلاب کے تحریری امور میں،
شوریٰ اسلامی کی مجلس میں،
الغرض ان کی تمام تر مصروفیات، خدمات اور اقدامات میں ان کے ہمراہ رہا ہوں اور ذرہ بھر سستی کو نہ پایا۔

حجاب و حیا اور کام میں لگن کی وجہ سے تظاہر، ریاکاری اور خودنمائی جیسی بری صفات سے بچتے تھے ------ اور اکثر لوگوں پر ہمارے دانشمند شہید کے حالات روشن نہیں ہیں۔

یہ اقدام ---------- اس بلند چہرہ کی شناسائی کے لئے منقطع نہ ہونے والا نقطہ آغاز ہے۔ اور بہترین اقدام ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ معاشرہ کے رشد اور انقلاب کے لئے بہترین خدمت ہے۔

مرحوم مزبور کی تحریریں، تقریریں، انٹرویوز، مذاکرات، رسمی وغیر رسمی میٹنگز، حوزہ علمیہ کی خدمات، میدان مبارزہ کی خدمات، شوریٰ انقلاب میں خدمات، شعبہ آموزش و پرورش کی خدمات، مدرسہ رفاہ کی خدمات، نشر فرہنگ اسلامی کی خدمات، وزارت عظمیٰ اور دیگر خدمات ان تمام موضوعات پر نشریات کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے تاکہ حق پرست لوگوں کے لئے آئندہ ایک علمی خزانہ اور مرجع بن سکے۔

قارئین محترم!

مذکورہ بالا عنوانات کو پڑھنے کے بعد اب مجھے حق پہنچتا ہے کہ اس بہت بڑے سانحہ میں اظہار افسوس کروں اور منافقین کی اس بہت بڑی اور کم سابقہ جنایت پر غصے اور نفرت کا اظہار کروں۔

اگر آپ میری جگہ پر ہوتے تو جانتے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ خصوصاً جب میں شوریٰ اسلامی کے دفتر میں بیٹھا تھا اور مجھے بم کے دھماکہ کی آواز سنائی دی، مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر باہنر اور شہید بزرگوار رجائی ------ بم دھماکے والے کمرہ میں تھے۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چیخ و پکار، آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل ملاحظہ کئے۔ اور حدس کہا کہ یہ سب بزرگوار اس آگ میں جل چکے ہیں۔ میرے جسم کے بند بند میں جلن محسوس ہونے لگی۔ سو سوائے دعا اور حسرت کے، کوئی کام نہ کر سکا۔

اس سے زیادہ المناک وہ وقت تھا جب پارلیمنٹ کی عمارت میں وزیر اعظم اور صدر کے جنازے کے تابوت کو کھولا گیا۔ میں نے ان کے جلے ہوئے جسموں کو دیکھا۔

ڈاکٹر باہنر کی میت کو سونے والے دانتوں کی وجہ سے شناخت کیا ---- گویا کہ ان کا منہ ضد انقلاب لوگوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے زندگی کے آخری لمحات کی ترجمانی کر رہا تھا اور کھلا ہوا تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں آیا -------- کہ رجائی اور باہنر نے اس وقت اپنے ۲۷ شہدا کے ساتھ بم دھماکے میں شہادت قبول کر لی لیکن ان کے ساتھیوں نے پھر سے ان کے اہداف کو مجسم کر دیا ہے۔

اب بھی جب وہ واقعہ میرے ذہن میں آتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے پوری دنیا کو ایک فولاد میں جمع کیا گیا ہے اور میرے سر پہ مارا جا رہا ہے اور اس کے باوجود زندہ ہوں۔ اپنی سخت جان پر تعجب کرتا ہوں بے شک جنایت کاروں کی سزا جہنم ہے۔

آخر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ -------- اس محترم خانوادہ اور باوقار، صبر و استقامت کے معظم پیکر کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے اس انقلاب کے قابل فخر سرمایہ اور یاد امام کو محفوظ رکھا۔ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صبر، اجر اور سعادت کا متمنی ہوں۔

ڈاکٹر باہنر کا مہجور دوست

علی اکبر ہاشمی رفسنجانی

پیش گفتار

آٹھ شہریور اس اسوہ کی برسی کی تاریخ ہے جو ہدایت الٰہی کی پختہ رسی کے ساتھ متمسک تھے اور حق کے راستے سے ایک لحظہ کے لئے بھی منحرف نہ ہوئے جنہوں نے راہ خدا میں انقلاب اسلامی کے قیام کیلئے جہاد کیا۔ خصوصاً نوجوانوں کی تربیت اور ان کے درمیان فکر اسلامی کے احیا کیلئے سرگرم عمل رہے۔

منافقین کے کینہ کی آگ میں شمع حق کے گرد پروانوں کی طرح جلے۔ درخشاں گوہر اور ان کی گرانقدر روح جسد خاکی سے آزادی پاکر معبود برحق سے پیوست ہوئی۔

یقیناً وہ لوگ جو انقلاب اسلامی کے اصل ستون اور رہبر کبیر حضرت امام خمینی (قدس سرہ الشریف) کے زور بازو تھے ---- ان کے آثار کی نشر و اشاعت کرکے انہیں محفوظ کیا جانا چاہئے۔

یہ آثار ان کے روشن نقش اور طریق حقیقت کے تشنہ افراد کی ہدایت کے علاوہ تاریخ کا ایک حصہ بھی ہیں تاکہ منحرف افراد کی تحریف سے بچاکر انہیں آئندہ نسلوں تک پہنچایا جاسکے جس سے وہ ان کے آثار اور ان کے قیام کے مقاصد سے آگاہ ہوں

البتہ!

حق تو یہ تھا کہ یہ اقدام بہت پہلے کیا جاتا۔ شاید مشکلات، موانع اور ہماری کم ہمتی ان کی تاخیر کا سبب بنی ہے۔ اگرچہ ناشرین محترم کی جانب سے ان کے بعض آثار

چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ ناشرین داد تحسین کے لائق ہیں لیکن پھر بھی یہ کام کافی دقت اور صرف وقت کے ساتھ سرانجام نہیں دیا گیا ----- یہ بات کہے بغیر چارہ کار نہیں ہے کہ ان کی شہادت کے فوراً بعد ہی ان کی آڈیو کیسٹیں اور قلمی تحریریں (اکثر آثار) منظر عام پر آگئے تھے۔

اس وقت ہم ان لوگوں کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ جن کے پاس ہمارے اس شہید مزبور کی کوئی آڈیو کیسٹ، قلمی تحریر یا تصویر ہو تو وہ ہماری طرف ارسال کریں یا ہمارے دفتر نشر فرہنگ اسلامی کے پتہ پر خط لکھیں۔

گفتار ہائی تربیتی:۔

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر کے آثار میں سے یہ دوسرا ہے جسے دفتر تدوین و نشر آثار شہید باہنر نے اکٹھا کرکے طبع کیا ہے۔ یہ کتاب شہید باہنر کی ان گفتار کا مجموعہ ہے جو ہمیں چند طریق سے حاصل ہوئی ہیں اور درج ذیل موضوعات پر مشتمل ہیں:۔

۱۔ بحث انسان اسلام۔

یہ ان کی دو تقریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ماہ خرداد ۱۳۵۸ شمسی میں مدرسہ عالی شہید مطہری (قدہ) میں کیں۔ ان میں دو عنوانات کو مطرح کیا گیا ہے "مقائیسہ انسان از دیدگاہ اسلام و مسیحیت" اور "انسان از دیدگاہ قرآن"

۲۔ سلسلہ گفتار (اسلام میں تعلیم و تربیت کے اصول):۔

یہ تین تقریروں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس کی پہلی کیسٹ انسان کے موضوع پر تھی جو ہمیں مل نہیں سکی اس کی کمی کو "انسان اسلام" نے دور کر دیا ہے۔

۳۔ "شوہر اور بیوی کے درمیان روابط"۔

یہ تقریر انہوں نے یکم اسفند (ایرانی سال کا آخری مہینہ) ۱۳۵۶ شمسی کو دبستان

رفاہ میں کی۔

۴۔ اولیا اور اولاد کے حقوق۔

۵۔ گھر اور مدرسہ کی ہمکاری۔

یہ تقریر دبستان رفاہ میں کی گئی تھی۔

۶۔ مسئلہ : تعلیم و تربیت اسلام کی نظر میں۔

ان کی ایک تقریر جو انہوں نے ۱۱/۱۰/۱۳۴۴ کو حسینیہ ارشاد میں کی۔

نوٹ :۔

چونکہ شہید بزرگوار انسان شناسی کے موضوع کو باقی تمام تربیتی موضوعات پر مقدم سمجھتے تھے لہٰذا ہم نے اس کتاب میں انسان اسلام کی بحث کو باقی تمام تربیتی گفتگو پر مقدم قرار دیا ہے۔

اب رہا مسئلہ کہ ہم نے ان ابحاث کو کیسے منظّم کرکے زیور تصنیف سے آراستہ کیا ہے ----- اس کے لئے چند نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔

۱۔ یہاں مطالب واضح و روشن تھے ----- لہٰذا سوائے چند نادر موارد کے کہیں بھی مطالب میں تبدیلی نہیں کی گئی۔ البتہ جہاں تقریر میں ناتمام جملے تھے ان جملوں کی صحت کے لئے ایک یا دو کلموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۲۔ دوران مباحث حاشیہ میں ایک علامت نظر آئے گی اور وہ علامت "د" ہے اس سے مراد اور مقصود ہمارا دفتر ہے۔ یعنی یہ اضافہ ہمارے دفتر کی جانب سے ہے۔

۳۔ یقیناً" اگر ان آثار کو شہید بزرگوار کی زندگی میں چھاپ کر شائع کیا جاتا تو اس کا حسن اپنا ہی ہوتا۔ لہٰذا اس کتاب میں اگر کہیں کوئی ضعف نظر آئے تو وہ ہماری وجہ سے ہوگا اور جو خوبیاں ہیں وہ شہید بزرگوار کی مرہون منت ہیں۔

امید ہے کہ --------

صاحب نظر افراد اور تحریر سے دلچسپی رکھنے والے لوگ جہاں ضعف یا لغزش کو محسوس کریں گے ہماری راہنمائی کرتے ہوئے اس کی نشان دہی کریں گے تاکہ اسے آئندہ خوب سے خوب تر صورت میں طبع کیا جاسکے۔

آخر میں!

ہم ان تمام لوگوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ان آثار کی جمع آوری میں ہمارے ساتھ تعاون کیا اور اللہ تعالیٰ سے استعانت اور مدد کی امید رکھتے ہیں۔

دفتر تدوین و نشر آثار شہید باہنر

مقائیسہ انسان

از دید گاہ اسلام و مسیحیت

ہم جو بحث بیان کرنا چاہتے ہیں ----۔ وہ اسلام کی رو سے انسان کے بارے میں ہے۔

یہاں واضح کیا جائے گا کہ ہم نے اپنی نظریاتی ابحاث کے سلسلہ میں انسان کے بارے میں بحث کو کیوں مطرح کیا ہے۔ چونکہ انسان کی بابت ہر مکتب اپنا نظریہ رکھتا ہے لہٰذا یہ انسان کی زندگی کے اہداف اور جہاں بینی میں تاثیر رکھتی ہے۔

خلاصہ!

انسان کی بابت ہر مکتب کا خاص نظریہ ہے کہ وہ کیسے زندگی بسر کرے؟ ----- شاید! عصر حاضر کی گمشدہ فکر میں سے سب سے بڑی وجہ اور وہ مسائل جو صنعتی اور مشینی زندگی کے چرخ کو فراموش کر چکے ہیں ----- ان کی بھی یہی وجہ ہے۔ کہ انسان کس طرح زندگی گزارے وہ اپنی کیسے اور کس طرح زندگی گزارنے کے مسئلہ میں کیا معیار رکھتا ہو؟

ارادہ کے علاوہ اس کے زندگی گزارنے کا میزان کیا ہونا چاہیئے؟ طبعی عوامل' تاریخ' حکومت' جغرافیائی حدود اور رہنے سہنے کے آداب۔ اور وہ چیزیں جو زندگی اور انسان کے تعامل ہیں کس قدر مؤثر ہیں؟ اندازہ اور اس کے انتخاب میں کس قدر تاثیر ہے؟ کیا اسے انسانی زندگی کے بسر کرنے میں کوئی اہمیت ہے۔ اور انسان اس اہمیت کو حاصل کرنے کی کس طرح کوشش کرے؟ یا عالم واقعی اور خارجی میں انسان کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے؟

انسان سازی

یہ مسئلہ HUMAN • بمعنی انسان اور HUMANITY • بمعنی انسانیت سے

مشتق ہے۔ یہ فلسفہ کی ایک اصطلاح ہے۔ جس کے معنی کا خلاصہ انسان سازی اور انسان مداری ہے۔ یعنی انسان کے کمال اور نجات کی طرف متوجہ ہوں اور انسان کے آزاد ارادہ و انتخاب کی اہمیت کے قائل ہوں۔

یہ مکتب حیرانی و پریشانی کے دور کے بعد وجود میں آیا۔ یہ قرون وسطیٰ کے دور کے بعد کا ہے دور قرون وسطیٰ اسکولاسٹیک یعنی مسیحی علم کلام اور کلیسا مداری کی حاکمیت کا دور ہے۔

قرون وسطیٰ کا دور

قرون وسطیٰ کے ہزار سالہ دور میں ----- علم و فلسفہ کلیسا کی تصمیم گیری میں مصروف تھے۔ اور درحقیقت یہ سختی اور کلیسا مذہبی تعصب اور کلیسائی کی حاکمیت مطلقہ اور فکر و عقل و اندیشہ کی محرومی کا دور ہے۔

یعنی ایک ہزار سال تک تمدن، علم، فلسفہ، حکومت اور یورپ کی باقی تمام چیزیں کلیسا کی حاکمیت میں تھیں۔

لوگوں کی فکر، انکا فلسفہ اور لوگوں کی فکر کرنے کی صلاحیتیں اس قدر منجمد ہو چکی تھیں ----- گویا ان میں ایک سلسلہ خلا اور سقوط شروع تھا۔ یہ کلیسائی اور وسطی دور کہلاتا ہے۔ اگر اس دور کی چھان بین کی جائے تو پتہ چلے گا کہ اس میں مسیحی علم کلام حاکم تھا۔ یہ درحقیقت اہل یونان کے مذہبی خرافات کا مجموعہ ہے جو انہیں یونان کی قدیم ثقافت سے وراثت میں ملے تھے۔ بنا برایں ----- اس دور میں علم و فلسفہ کی پروان و ترقی توقف میں ہی رہی۔

گروہ گروہ کی قتل و غارت اور پھانسیوں، نے فکر کو شبہ میں ڈال کر اس کا گلا گھونٹ

دیا ----- درحقیقت اس دور میں اپنے نظریات اور عقائد کو دوسروں پر ٹھونس دیا جاتا تھا۔

فکر کی پریشانی کا دور

قرون وسطیٰ کے دور کے بعد ------ یورپ والوں کے قیام کے نتیجہ میں رنسانس (فکر کی پریشانی) کا دور آیا۔ اس دور کے تقاضوں میں سے ایک انسان کا حیران واقع ہونا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس سے پہلے کہتے تھے: کلیسا کا خدا اور کلیسا کا مذہب ہی سب کچھ ہے۔

ارادہ بلکہ مصمم ارادہ، مصلحت اندیشی اور خیر و کمال کی بابت اظہار نظر اور انسان کی حرکت زندگی کے ہدف اور باقی سب کچھ ان کے کلیسا کے خدا اور کلیسا کی روحانیت تھی۔ انسان شناسی قرون وسطیٰ کے دور والوں کے لئے ایک سازش تھی جس سے لوگ مضطرب ہوگئے۔ یعنی یہاں انسان اپنے ازلی ارادہ یا اپنی طبعی کیفیت کے مقابلے میں جبر کی حالت سے باہر آیا جس کے نتیجہ میں فلسفی اور علمی کلیسائی فکر انسان سازی اور HUMANISTY کی صورت میں ظاہر پذیر ہوئی۔

درحقیقت!

فکر کی پریشان حالی جسے انسان سازی کے دور نے پیش کیا تھا ------ کو اولاً

ان کے مذہب کے مقابلہ میں مافوق طبیعت جبری ارادہ سے آزادی کی راہ دکھائی۔

اور ثانیاً یہ دور آیا جس سے انسان کی عقل اور فکر کو مسیحیوں کی محدود علم کلام کی ابحاث سے آزاد کرایا گیا اور اس کے بعد علم اور فکری کوشش کو انسان کی خدمت میں قرار دیا گیا۔

لہٰذا اس دور کے بعد ------ تمام علمی و فکری صلاحیتوں کو استعمال کیا گیا تاکہ انسان کو آزادی مل سکے اور دین و مذہب کی سرکوبی ہوسکے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

اس کی علت اور وجہ یہ تھی کہ انسان کے بارے میں یونان میں ایک تصور پایا جاتا تھا ------ جس کی بابت وہ کہتے تھے کہ انسان تو خدا کے مقابلے میں برابری کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان اور خدا کا آپس میں ربط تضاد، رقابت اور حسادت کا ہے۔

خدا نہیں چاہتا کہ انسان اپنا قدم اپنی قدرت، اختیار، ارادہ، علم و آگہی کے ساتھ اٹھائے۔ بلکہ خدا تو انسان کو اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ خدا کس وقت اپنی حاکیت کا قائل تھا؟ اس وقت جب انسان بے سمجھ اور اپنے تصرفات میں نا بلد اور ناتواں تھا۔ وہ انسان جو محکوم ہے اور جس کا سر نیچے جھکا ہوا ہے اور جو نابلد ہے ------- وہ ایک غلام آزاد آسمانی خداؤں کے لئے ایک غلام قرار دیا جاسکتا ہے۔ انسان اور شیطان کی کہانی جسے اہل یونان بیان کرتے تھے اس کا قیاس اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں کیا جائے تو مذکورہ مطالب کے رموز روشن ہوسکتے ہیں۔

قرون وسطیٰ کی مسیحیت میں

خدا اور انسان

اہل یونان کی افسانوی دنیا میں پرومتہ نامی ایک شخص ہے جو درحقیقت ہماری اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شیطان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرومتہ آسمان پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دست و گریبان ہوا۔ اور جب خدا سوئے ہوئے تھے تو یہ موقع پا کر مقدس آگ (نور) کو چرا کر زمین پر آگیا اور وہ نور انسان کو تحفہ میں دے دیا۔ یہ ہدیہ ملتے ہی انسان کی آنکھیں اور کان کھل گئے (یعنی انسان کو حقیقت حال نظر آگئی) اور وہ سمجھنے لگا۔

اب انسان اپنے ارادہ اور انتخاب پر قادر ہو گیا۔

اور ادھر جب خداؤں کی آنکھ کھلی تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ نور جس کی ہم نے ہزاروں سال سے حفاظت کر رکھی تھی اور ہم کہتے تھے کہ اسے کوئی چور چرا کر انسان تک نہ پہنچا دے ----- وہ نور اب ان کے پاس نہیں رہا۔ بلکہ انسان تک پہنچ گیا ہے۔ اسی لئے اس نور کا چور (شیطان) خداؤں کی بارگاہ میں مورد قہر و غضب قرار پایا اور ان کی بارگاہ سے راندہ گیا۔

یعنی انسان تو خدا کا رقیب تھا اور خدا اس پر حسد کرتا تھا کہ کہیں اس کی آنکھیں نہ کھل جائیں لیکن اب ایک شخص نے وہ نور' ہدایت' روشنی خداؤں سے چرا کر انسان کے حوالے کر دی ہے جس کے نتیجہ میں ان خداؤں نے کف افسوس ملے اور اپنے ہاتھوں اور سر پر ہاتھ مارے کہ کیوں یہ مصیبت ہمارے سر پر آن پڑی ہے۔ اب انسان بھی اپنے آپ کو ان کا رقیب سمجھنے لگا جس سے اس پر بھی خدا غضبناک ہوا۔ لہٰذا وہ انسان کے دائمی دشمن بن گئے ہیں۔ یہ سب مطالب یونانیوں کے افسانوں میں ملتے ہیں۔

جب عیسائیوں نے چاہا مسئلہ انسان' مسئلہ شیطان' مسئلہ آدم' مسئلہ بہشت اور اسی قسم کے دیگر مسائل ----- کی توجیہہ کریں ----- تو انہوں نے یونانی افسانوں ہی کی بنیاد پر ان کی توجیہہ کی۔

یہودیوں کے ہاں بھی آپ ان کی کتاب توریت کے باب عہد عتیق میں دیکھ سکتے ہیں کہ جب انہوں نے کائنات کی خلقت اور حضرت آدمؑ کی خلقت کو بیان کرنا چاہا ----- تو کہا کہ وہ درخت جس سے انسان کو منع کیا گیا تھا درخت نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت تھی یعنی ان کے ہاں یہ تصور ہے کہ خدا نے حضرت آدمؑ کو درخت

معرفت کا پھل کھانے سے اس لئے منع کیا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان بامعرفت ہو اور اس کو آگہی حاصل ہو۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام گئے اور اس معرفت کے درخت کا پھل کھا لیا تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوا کہ اب تو آدم علیہ السلام سب کچھ سمجھ گئے ہیں ----- حضرت آدم علیہ السلام جنت میں برہنہ تھے اب پھل کھانے کے بعد انہیں اپنی عریانی کا احساس ہوا اور پتہ چلا کہ میں تو عریانی کی حالت میں پھر رہا ہوں ------ چنانچہ اس درخت کے نیچے سے اللہ تعالیٰ کی آواز بلند ہوئی: اے آدم! تو نے ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا ہے تو اب تو ان چیزوں کو سمجھنے لگا ہے جن سے تو ناواقف تھا؟ اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوا اور حسد کی آگ شعلہ ور ہوئی اور آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال دیا۔ اس لئے کہ اب خدا نے دیکھا کہ یہاں تو میرا رقیب پیدا ہو گیا ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ------ کہ یہ تصورات ایک مذہبی فکر، ایک مکتب اور ایک مقصد کے لوگوں میں کس قدر اثر انداز ہو سکتے ہیں؟ یعنی بنیادی طور پر انسان کا مذہب کے ساتھ رابطہ مخاصمانہ ہے؟ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کا گناہ یہ تھا کہ وہ حقائق سے مطلع ہو گئے تھے اور انہیں معرفت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کے نظریات کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ انسان کس صورت میں اللہ تعالیٰ کا مطیع رہ سکتا تھا؟ اس صورت میں کہ جب وہ بے معرفت تھا اور اب جبکہ معرفت حاصل کر چکا ہے گنہگار ہو گیا ہے۔ بنا بریں اگر علم ترقی کرنا چاہے تو کیا کرے؟ ضروری ہے کہ مذہب کے خلاف ہو جائے اور ایسا کرنے سے وہ گنہگار بن جائے گا۔

پس قرون وسطیٰ کا دور ظلم و بربریت اور عقل و فراست کو زندہ در گور کرنے کا دور تھا۔ درحقیقت یہ ایسا دور تھا کہ لوگ کلیسا کی اطاعت مطلقہ بجا لائیں (یعنی کلیسا ہی

حقیقت ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے) اور اگر انسان علم و ترقی کی راہ پر گامزن ہو تو ------ آزاد ہو جائے گا اور کلیسا کی اطاعت کو توڑ دے گا اور گنہگار ہو گا۔ پس نافرمانی اور گناہ کا راستہ ترقی بنے گا۔

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ----- اگر مسیحی مکتب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی روح پیدا ہو تو وہ حضرت عیسیٰؑ کی تلاش میں پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ایک شخص کو منتخب کر لیا جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فیضان اس پر نچھاور کرتا ہے اور اسے لطف عطا فرماتا ہے۔ البتہ انسان ذاتاً" گنہگار اور عاصی ہے اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ہے۔ فقط ایک حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے جن میں اللہ تعالیٰ کے روح کے الطاف کو ودیعت کیا گیا۔ پھر انہی عیسیٰؑ نے اپنی روح کو کلیسا کے ارباب' اپنے حواریوں اور عیسائی رہبروں میں منتقل کر دیا۔ اب فقط روحانی لوگ حضرت عیسیٰؑ کے طریق میں روح خدا کے وارث ہیں۔ اور صرف روحانی اور کلیسائی باپ ہی مہر الٰہی کے مستحق ہیں۔ اور ان کے علاوہ باقی لوگ مورد غضب الٰہی ہیں انجیل اور مسیحیت کے قول کے مطابق حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور اس لئے صلیب (سولی) پر چڑھ گئے کہ باقی انسانوں کے گناہوں کا فدیہ بن جائیں۔ یعنی انسان ذاتی طور پر گناہ کا پتلا ہے اسی لئے حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تاکہ انسانوں کے گناہوں کا بدلہ اور جبران ہو سکے۔ اب جو جو لوگ اس روح خدا کے ساتھ پیوست ہو گئے ----- وہ عفو خدا کے شامل حال ہوں گے۔ یعنی لوگ فقط اللہ تعالیٰ کی روح اور آبائے کلیسا کی پناہ کے سائے میں ہی غضب الٰہی سے بچ سکتے ہیں۔

یہ انہی افسانوں کا خلاصہ ہے جنہیں یونانی افسانہ نگاروں نے تحریر کیا ہے اور انہی مطالب کو یہودیوں نے توریت میں شامل کر دیا اور آخر کار یہ مسئلہ عیسائیت میں داخل

ہو گیا۔

اس طرز فکر کا انسان سازی کے دور کی پیدائش پر اثر

ہم دیکھتے ہیں کہ -------- بعد والے یورپی Humanist اور ان کے بعد والے دوسرے لوگ حتی کہ مارکس انسان کی نجات اور اس کے تکامل کے لئے Humanist نظریہ سے متاثر ہیں۔ یعنی جب وہ انسان کی آزادی اور شرف و افتخار کے بارے میں کہتے ہیں تو گویا ہوتے ہیں کہ:

"ہم چاہتے ہیں کہ انسان کو دین کی قید سے آزاد کیا جائے" لہٰذا اٹھارھویں صدی یورپی Radicalist کی اصطلاح کے مطابق (جو انسان کی نجات اور شرف کی بابت) کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سے خدا کے عقیدہ کو ختم کر دیں اور اس کی جگہ پر وجدان کو قرار دیں تاکہ انسان کی حرکت کا آغاز ہو۔ اور جب تک خدا کا عقیدہ انسان کے اندر ہے ----- وہ قید کے بندھن میں اسیر ہے لہٰذا اپنے اندر سے اس عقیدہ کو ختم کر کے اس کی جگہ وجدان کو قرار دیں جو ایک قسم کا سرمایہ ہے۔ جب انسان کے اندر وجدان بیدار ہوتا ہے تو وہ آزاد ہو جاتا ہے اور اس کے تکامل کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ بنا بریں ----- ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ اور سوسائٹی سے آشنا افراد اور مغربی روان شناس اسی سمت رواں دواں ہیں۔ جب کسی انسان کو شخصیت کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں تو اس سے خدا کے تصور کو ختم کر دیتے ہیں گویا کہ کسی کو شخصیت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے خدا اور مذہب کو مات دی جائے۔

اسلامی نقطہ نظر سے خدا اور انسان کا تعلق

اب ہم دیکھتے ہیں ------ کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے انسان کے بارے میں کیا

نظریات ہیں نیز انسان اور خدا کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اسلام نے نہ صرف صحیح اور حقیقی راستہ لوگوں کے اختیار میں دیا ہے بلکہ اسلام نے لوگوں کے اذہان سے گزشتہ مذاہب کے انحرافات اور تحریفات کو صاف کیا ہے اور ان سے اذہان کو پاک کیا ہے۔ اسلام کے محکم امور میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ گزشتہ الٰہی ادیان اور انبیاؑ کا دفاع کرتا ہے۔ یہ اسلام کی عیسائیت اور یہودیت کے لئے ایک خدمت ہے۔

شیطان کیوں مردود قرار پایا؟

اسلام کی گراں قدر تعلیمات سے انکشاف ہوتا ہے کہ شیطان کے مردود ہونے کی علت اور سبب یہ تھا کہ اس نے حکم خداوندی سے روگردانی کرتے ہوئے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ نہ کیا تھا ------ اور اسی نافرمانی کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین"

اس (شیطان) نے (سجدہ سے) انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔ اس کے بعد بھی ------ جب وہ اپنے تکبر پر مصر رہا تو ارشاد پروردگار ہوا۔ **فاخرج انک رجیم وان علیک لعنتی الیٰ یوم الدین۔**

(اے شیطان) میری بارگاہ سے نکل جا کیونکہ تو دھتکارہ ہوا ہے اور قیامت تک تجھ پر میری لعنت برستی رہے گی۔

یہی وجہ تھی جس کی بنا پر شیطان بارگاہ ایزدی سے مردود قرار پایا اور یہ بات پہلے دن سے معلوم ہوگئی تھی کہ حضرت آدمؑ شرف اور بزرگی کے حامل ہیں جن کی عظمت اور شخصیت مسلم ہے۔ لہٰذا تمام قوائے غیبیہ کو اور فرشتوں کو ان کی تعظیم کی بابت کہا گیا۔

حضرت آدمؑ کو سجدہ کیوں کرایا گیا؟

اس لئے کہ ------- ارشاد پروردگار ہوا۔

"وعلم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الملائکة --------"

(بقرہ /۳۱))

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام اسما کی تعلیم دی پھر انہیں **فرشتوں** کے سامنے (امتحاناً) پیش کیا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدمؑ کو آگاہ کیا اور بعد میں اسے علم کی دولت سے مالا مال کیا جس سے حضرت آدمؑ نے شرف اور بزرگی کو پالیا اور اس شرف کے تحت ان کے اندر ایک شخصیت پیدا ہوگئی جس سے فرشتوں پر ان کا شرف اور تعظیم لازم ہوگئی۔

وہ بات جسے مسیحیت، یہودیت اور اہل یونان نے بیان کیا ہے کہ شیطان نے انسان کی خدمت کرتے ہوئے اللہ سے نور کو چرایا اور زمین پر انسان کے حوالے کر دیا ------ لیکن ان کے مقابلے میں اسلام کہتا ہے کہ خدا نے خود انسان کو علم کے زیور سے آراستہ کیا۔ بعد میں فرشتوں سے تعظیم کی بابت کہا۔

یہودیت و مسیحیت کے مکاتب میں شجرہ ممنوعہ سے مراد علم و معرفت ہے (کہ علم و معرفت کے قریب نہ جائیں) ------ درحالیکہ اسلام میں شجرہ ممنوعہ سے مراد ہوا پرستی، مادیت کی اسیری ہے اور یہ سب کچھ انسان کے ارادہ حریت اور اس الٰہی امانت کے مقابلے میں ہیں جو اسے دی گئی ہے۔ یعنی انسان جو شرافت و بزرگی کے بل بوتے پر امانت الٰہی کا حامل ہے، سے کہا جاتا ہے کہ مادیت، غذا خوری، لذات دنیا اور ہوا و ہوس کا اسیر مت بننا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت آدمؑ کا عصیان یہ تھا کہ ------ انہوں نے

اپنے ملکوتی' الٰہی اور غیبی جنبہ کو زیر قدم روند ڈالا اور ایک لحظہ کیلئے اپنے کو مادیت میں گرفتار کر ڈالا اور انہوں نے مادی لوگوں کے طریق کار کو اپنایا جو ان کے عصیان کا سبب بنا۔

پس اگر کوئی شخص اس سے نجات پانا چاہے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟! نجات اور سرخروئی اسی میں ہے کہ وہ مادیت کی قید سے آزادی حاصل کرے۔ اور خواہشات نفسانی کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ یعنی نجات اور کمال کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی میں علم و معرفت اور امانت الٰہی و ملکوت غیبی ------ کو اختیار کرے اور ان کی راہنمائی سے مادیت کے جال سے آزاد ہو کر روحانیت کے تکامل کی طرف پرواز کرے۔

یہ نظریہ کلیسائی فکر و اندیشہ کے مقابلے میں درست ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ انسان کا گناہ یہ ہے کہ وہ معرفت سے ہمکنار ہوا ہے۔

کلیسائی فکر میں ایک اور نقطہ بھی قابل توجہ ہے ------- یہ کہ سورج کی قدرت' دریاؤں و سمندروں کی قدرت' صحراؤں کی قدرت ان کے پروردگار کے قبضہ قدرت میں مسخر ہے۔ اگر انسان دریا سے استفادہ کی کوشش کرے تو اسے دریا کو مسخر کرنا پڑے گا جس سے وہ اللہ کی قدرت پر قابض ہوگا معدنیات' دریاؤں' صحراؤں' سورج اور باقی تمام موجودات کے خزانوں کا کنجی بردار فلاں خدا ہے اگر انسان کوشش کرے اور ان کی بابت آگاہی حاصل کرے تو گویا اس نے ان کی طبیعت میں تصرف کیا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ حقیقتاً" اس خدا کو خطرہ میں ڈالتا اور اس سے قدرت کو چھین لیتا ہے۔ لہٰذا علمی جدوجہد اور خدا کی خدائی میں مبارزہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ علم میں اس لئے کوشش کرنا کہ فطرت پر غلبہ اور تصرف حاصل ہو جائے خدا کی قدرت

کے ساتھ مقابلہ شمار ہوگا۔

اس یونانی، یہودی، مسیحی فکر کے مقابلے میں اسلام اپنے خاص نقطہ نگاہ سے بحث کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آیات ہیں جن میں ارشاد ہے کہ ------- اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند، زمین، دریا سب کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے۔ ہم ان آیات میں سے چند ایک کو بیان کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

"الم تروا ان اللّٰہ سخرلکم مافی السمٰوات و مافی الارض۔" (لقمان/ ۲۰)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے تمام ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔

"وسخر لکم اللیل والنھار والشمس والقمر" (نحل/۱۲)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رات، دن، سورج، چاند کو مسخر کر دیا ہے۔

"اللّٰہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ۔" (جاثیہ/۱۲)

وہ اللہ جس نے تمہارے لئے سمندروں کو مسخر کیا تاکہ تم اس کے امر سے اس میں کشتیاں چلاؤ۔

" ..... وسخرلکم الانھار " (ابراہیم/۳۲)

اور اللہ نے تمہارے لئے نہروں کو مسخر کر دیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں تسخیر کائنات کے حوالے سے ارشاد پروردگار ہوتا ہے۔

سورج، چاند، دریا، رات، دن اور جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر موجود ہے سب کچھ انسان کے تابع اور مسخر ہیں اور ان سب پر انسان کاملا" تسلط رکھتا ہے۔

اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ انسان کی خلقت کے مراحل کے بعد ارشاد فرماتا ہے۔

"--------**ثم انشاناہ خلقا" اخر**------(مومنون/۱۴)

مراحل خلقت (یعنی سب سے پہلے نطفہ تھا پھر علقہ پھر مضغہ پھر ہڈیاں پھر گوشت) کے بعد ارشاد ہوا پھر ہم اسے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کریں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ------- **ونفخت فیہ من روحی"** (حجر/۲۹، ص/۷۲)

میں نے روح کو انسان میں پھونکا۔

پس انسان انسان تب بنا جب اللہ تعالیٰ نے اس میں روح کو پھونکا۔ یہ ایک قسم کا طبعی تکامل ہے۔ یعنی یہ طبعی حرکت ہے جو تدریجاً" رشد کو پاتی ہے جس سے انسان کے لئے ایک قسم کا شرف پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ایک جنبہ فرش سے عرش کی طرف صعود کرنا ہے۔ گویا ایسا کرنے سے اس کی ایک نئی خلقت وجود میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح اس کے باطن میں موجزن ہوتی ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ کی خدائی کا نمونہ ہیں ------ وہ انسان کو عطا فرما دیتا ہے جس سے وہ انسان ارادہ اور قدرت کا حامل ہو جاتا ہے۔ جس سے اس کے وجود میں توانائی اور تصرف کے ارادہ اور طبیعات کی تسخیر پیدا ہو جاتی ہے اور علم و آگاہی سے روشناس ہو جاتا ہے۔ بنابریں ------ آدم کی یہ تعریف کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح کے پھونکے جانے کے بعد پیدا ہوا ------ اس بات سے فرق رکھتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انسان پیدا ہوا، پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس نے مقابلہ کیا پھر نافرمانی کا مرتکب ہوا، پھر اس نے آگاہی اور آشنائی کو پایا۔ یا یہ کہ خدا کی روح تو فقط ایک ہی شخص کے وجود میں آسکتی

ہے باقی سب لوگ اس کے دست نگر رہتے ہیں اور اس کے ہاتھوں مسخر اور اس کے غلام بنے رہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے نجات حاصل کر سکیں۔ حقیقتاً" یہی بحث کی بنیاد ہے۔

گذشتہ بحث کا نتیجہ

اب جب یہ معلوم ہوگیا کہ انسان کے بارے میں ہمارا اصلی رویہ کیا ہے اور بنیادی طور پر اسلام انسان کو کس طرح دیکھتا ہے یک لخت ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میدان میں مذہب کے بارے میں جتنے رویے ظاہر کئے گئے ہوں وہ بالکل پوچ ہیں۔ ہم اس بات کے لئے مجبور نہیں کہ اجتماعیات جاننے والے میں انسان شناسوں میں اور انسان کو بلند و بالا گردانئے میں فلسفیوں نے مذہب کی پیدائش' اس کی ترقی اور آخر کار اسے رد کرنے اور محکوم کرنے کے بارے میں کیا ہے۔ ان کا جواب دیں اور ان کی روح کی مدافعت کریں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر آپ نے ایک ایسے مبداء سے بات کی ہے۔ جو ہمارا اصول نہیں۔ آپ کا رویہ ہمارے نقطہ نظر سے بالکل برعکس اور اس سے ۱۸۰ درجے منحرف ہے۔ ہمارا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ کچھ اور ہے۔ یہ فلسفی حضرات جو انسان دوستی کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہماری خواہش ہے کہ انسان کو آسمانوں کی اسیری سے نجات دیں۔ اور اسے آزادی سے ہم کنار کریں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ مدت ہوئی جب انسان پیدا ہوا اس وقت سے آسمانی شعاعوں نے اسے اس قابل بنایا کہ اسے آسمانی ترقی اور تکامل کی حرکت حاصل ہو۔ دوسرے لفظوں میں بنیادی طور پر اس کا انسان ہونا اس بنا پر تھا کہ وہ تکامل حاصل کر پائے۔ اور حرکت صعودی کا مالک ہو یعنی وہ اوپر کی جانب اٹھے اور بالآخر اللہ کی طرف جا سکے۔ ارشاد پرورگار ہے "**یا ایھا**

الانسان انک کا دح الی ربک کدحا فملا قیه " (انشقاق/۶) اے انسان تو اپنے رب کی طرف کوشاں ہے اور تو اسے پالے گا۔

یعنی انسان کے لئے بنیادی مسئلہ اللہ سے ملاقات ہے۔ اس طرح سے ہم اساسی طور پر انسان کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی شناخت

اب ہماری بحث اس میں ہے کہ دیکھا جائے :

اسلام کے نقطہ نگاہ سے انسان کی ماہیت کیا ہے؟

انسان کے ابعاد وجودی اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں کیا ہیں؟

اسلام انسان کی کس طرح وضاحت اور تفسیر کرتا ہے؟

اسلام میں انسان کی آگہی اور ارادہ کی کیا حیثیت ہے؟

اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کا انسان کے ارادہ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

اس بحث کا مسئلہ عقل و جبر اور اختیار کے ساتھ گہرا تعلق ہے کہ ان مسائل میں اشاعرہ، معتزلہ اور ہمارے عقیدہ، "امر بین الامرین" کا نقطہ نظر کیا ہے؟

اس بحث کے ساتھ جارحیت پسند مادیت کے فلسفہ کا تعلق ہے اور خصوصاً جسے فرانسیسی فلسفی سارٹر نے بیان کیا ہے اور اس بحث کو پر رونق کیا ہے۔ اب جبکہ اس موضوع پر بحث ہو رہی ہے تو ضروری ہے کہ سارٹر کے نظریات پر بھی بحث کی جائے۔ اور دیکھا جائے کہ اسلام انسان کو جو آزادی دیتا ہے اس آزادی میں اور یہودیوں اور عیسائیوں کے مکتب کی آزادی میں کس قدر فرق ہے اور وہ اس آزادی کی بابت کیا کہتے ہیں۔

نیز ضروری ہے کہ اس مکتب کی طرف اشارہ کیا جائے۔ جو کائنات میں موجودات کے بارے میں بطور کلی اور انسان کی بابت بطور خاص کسی ہدف اور مقصد کا قائل نہیں ہے اور انسان کی زندگی کو بے مقصد سمجھتا ہے اور اتفاقا" یہ طرز فکر بلا واسطہ یا بالواسطہ نوجوان نسل کی دنیا میں اثر رکھتی ہے۔ خصوصا" اس مشینی دور میں۔ صنعت و حرفت اور مشینی دور نے اس طرز فکر کے پھیلنے کے لئےاہم بنیاد فراہم کی ہے۔

اور آخر میں انسان اور اس کے کمال کی بابت اور بعد معاد کی بابت اشارتا" ذکر ضروری ہے۔ ان سب ابحاث سے انسان کی زندگی کے اہداف اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں تلاش کرنے کی جستجو اور کوشش ہوگی کہ دیکھا جائے کہ اسلام کے نقطہ نگاہ میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

اور ایسا کرنے سے انسان کی اہمیت' انسان کی آزادی کے ارادہ' فلاسفہ کی آزادی انسان اور انسان کے وہ تکامل جن کی بابت تمام مکاتب فکر بحث کرتے ہیں ------ سب میں کامل دسترس حاصل ہو جائے گی

میرا خیال ہے کہ ----- مختصرا" انسان کے اسلامی اور مارکسزم نقطہ نظر کی طرف اشارہ کیا جائے۔ البتہ ہم یہاں ان کے طرز معاشرت' اقتصادی' تاریخی فلسفہ کی مباحث میں وارد ہونے کا قصد نہیں رکھتے۔

اس بحث سے متعلق آیات قرآنیہ کے عناوین

اسلام کے نقطہ نگاہ سے انسان کی شناخت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان آیات کی طرف مراجعت کی جائے جو اس بحث سے متعلق ہیں۔ ان میں سے چند ایسی آیات ہیں جو انسان کے مختلف عنوانات پر مشتمل ہیں اور بعض آدم کی خلقت

کے عنوان پر محیط ہیں۔ اور ان کی معرفت کا حاصل کرنا اسلام میں انسان کے مقام کو معلوم کرنے کے لئے بہت زیادہ موثر ہے البتہ چند موارد میں انسان کی بجائے کلمہ "بشر" بھی استعمال ہوا ہے جو اپنی جگہ پر موثر ہے۔ قرآن مجید میں بہت زیادہ مقامات پر لفظ "ناس" استعمال ہوا ہے یہ بھی بہت زیادہ مفید ہے۔

لیکن شاید یہ لفظ انسان والی آیات سے زیادہ موثر نہ ہوں۔ اسی طرح وہ آیات جو انسان کی فطرت کی بابت بیان ہوئی ہیں وہ بھی اس بحث میں موثر ہیں۔ اور کچھ آیات ایسی ہیں جو انسان کے لئے آزادی (فکر) کے مسئلہ کو بیان کرتی ہیں۔

مثلاً"

" ------- **فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر** ------" (کہف/۲۹)

جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر بن جائے۔

"**انا ھدیناہ السبیل اماشاکراو اما کفورا**" (دہر/۳)

ہم نے اسے (صحیح) راستہ کی ہدایت کر دی ہے اب وہ شکر گزار بن جائے یا ناشکرا بن جائے۔

چند آیات جو انسان کے اجتماعی اعمال میں پریشانی کی بابت وارد ہوئی ہیں البتہ یہاں وہ تمام آیات مقصود نہیں ہیں جن میں لفظ "عمل" استعمال ہوا ہے۔

مثلاً":

" **فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرایرہ**"

(زلزال/۷،۸) جو شخص ذرہ برابر نیکی بجالائے گا وہ اسے دیکھے گا اور جو شخص ذرہ برابر برائی بجالائے گا وہ اسے دیکھے گا۔

یہ آیت اگرچہ معاد (قیامت) کے دن کو بیان کر رہی ہے لیکن انسان کی شناخت

کے ابعاد کو بھی بیان کر رہی ہے۔ اور اس ضمن میں انسان کا ارادی عمل سر فہرست موثر ہے۔

"ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم-----" (رعد/۱۱)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو خیال جسے آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

"وان لیس للانسان الا ماسعی" (نجم/۳۹)

انسان کے لئے سوائے اس کی کوشش کے کچھ بھی نہیں ہے۔

اس سلسلے میں اسی طرح وہ آیات جو انسانی تاریخ اور اس کی تبدیلی کو وضع کرنے میں انبیاء کے اثرات کا ذکر کرتی ہیں اور اسے واضح کرتی ہیں۔ ان کو مسلمانوں کے خدوخال میں روشن دیکھیں خصوصاً" مارکسزم کے دبستاں اور وہ دبستان جو انسان کو مجبور گردانتے ہیں وہ اسے ذاتی طور پر گناہ اور رذالت کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان دبستانوں کی رہنمائی اسلام کرتا ہے۔

وہ آیات بھی بالواسطہ طور پر ہماری بحث میں موثر ثابت ہو سکتی ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ظلم کے صدور کی نفی کا ذکر کرتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے ہمیں صرف ان آیات کی تلاس میں نہیں رہنا چاہئے جن میں لفظ "انسان" یا لفظ "بشر" استعمال ہوا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ معمولاً" ان آیات کا قیامت کی بحث کے ساتھ گہرا تعلق ہے جن میں اللہ تعالیٰ سے ظلم کے صدور کی نفی کی بابت ذکر ہوا ہے۔

(اس مسئلہ میں مزید اطلاع کے لئے ہماری اور شہید بہشتی کی کتاب شناخت اسلام، آقای شہید مطہری کی کتب "عدل الٰہی" اور "انسان و سرنوشت" اور آقای جعفری تبریزی کی کتب "جبر و اختیار" اور "آفرینش انسان" کیطرف رجوع کیا جائے۔)

اس طرح کہ خداوند تعالیٰ کا بروز قیامت لوگوں کا مواخذہ کرنا اس کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ لوگوں نے اپنے نفسوں پر خود ظلم کیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عمل میں جبر نہیں ہے بلکہ لوگ خود مختار ہیں۔ اور کوئی شخص اچھائی یا برائی کو جاننے کے بعد انجام دے تو نیکی کے بدلے جزا اور برائی کے بدلے سزا ظلم نہیں ہوگی اس بحث میں وہ آیات جو ملا ئکہ کے حضرت آدمؑ کو سجدہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں یا حضرت آدمؑ کے عصیان کی بابت وارد ہوئی ہیں یا شیطان کے قصہ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں سب کی سب بیان کی جائیں تو ان کا بہت زیادہ اثر مرتب ہوگا۔ مجموعاً" یہ آیات ہی ہماری بحث کو روشن اور واضح کر سکتی ہیں۔

اگر آپ ان آیات میں غور و خوض کریں اور توجہ کے ساتھ ان کا مطالعہ کریں ---- تو ان میں ایسی آیات ملیں گی جن میں انسان کو کوسا گیا ہے۔ یعنی **ظلوم' جهول' کفور** کی انسان کی طرف نسبتیں دی گئی ہیں۔

ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ ------ ان آیات کی روشنی میں ہماری تکلیف شرعی کیا ہے؟

اس بحث سے متعلق روایات کے عناوین

اس بحث سے اچھے نتائج حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی آیات کے علاوہ روایات سے بھی استفادہ کیا جائے۔ اور اس موضوع میں روایات بہت زیادہ ہیں۔

ہماری روایاتی کتب کے ابتدا میں کتاب عقل و جہل و علم اس موضوع کو مشخص کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

وہ ابواب جو ظلم اور عدل کے مسئلہ میں ایمان اور کفر کی بابت وارد ہوئے ہیں

اور وہ مباحث جو اخلاقیات کے حوالے سے صادر ہوئی ہیں مثلاً" انسان کا ہوا و ہوس کے خلاف مبارزہ' اخلاق مذمومہ جیسے حسد' بغض' کینہ' ظلم یا وہ اخلاق جو انسان کے کردار کو بلند کرتا ہے ----- ان سب سے ہماری بحث میں معاونت اور راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

ہم ان ابواب میں دیکھتے ہیں کہ ------- اصلاً" حسد' بخل' غیبت' جھوٹ کے خلاف مبارزہ آرائی کا حکم دیا گیا ہے۔ انہی مباحث سے اخلاق رذیلہ اور مادی جذبہ اور پست اخلاق' بخل' حسد' ظلم کو کشف کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی حال ہے انسان کی اس قوت کا جس کے ذریعے وہ ان مفاسد سے مبارزہ کرتا ہے۔ بنا بریں کتب روایاتی میں موجود اخلاقی مباحث سے بہت زیادہ استفادہ ہو سکتا ہے اور وہ مفید بھی ہیں۔

قرآنی نقطہ نظر میں انسان

قرآن مجید کے نقطہ نظر سے انسان کی بابت چند طریقوں سے بحث کی جاسکتی ہے۔

ا۔ خلافت انسان

انسان کی خصوصیات میں سے ایک ----- جسے قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے انسان کی خلافت کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ ارشاد پروردگار ہوا:

واذ قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ" (بقرہ/۳۰)

(اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر خلیفہ بنا رہا ہوں۔

اس بارے میں مشہور ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی جانب سے خلیفہ ہے۔ لیکن اس آیت اور دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلافت کی تصریح نہیں کی گئی بلکہ صرف یہی کہا گیا ہے کہ میں زمین پر خلیفہ بنا رہا ہوں۔ اس واقعہ میں ایک احتمال ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اپنے لئے خلیفہ بنا رہا ہوں۔ اور یہ طبعی امر ہے کہ جب مقصود خلیفتہ اللہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قدرت اور حاکمیت جو اللہ تعالیٰ کو کرۂ ارض اور تمام جہانوں پر ہے اس میں سے تھوڑی سی انسان کے لئے بھی قرار دی گئی ہے۔

البتہ!

ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ خلیفہ سے مراد یوں بیان کی جائے کہ وہ قدرت جو پہلے روئے زمین پر تھی اسی قسم کی حاکمیت اور تصرف کی ایک نوع اب بھی زمین پر ہے۔

کیونکہ معمولاً" خلافت ادارہ اور حاکمیت میں ایک قسم کی جانشینی ہوتی ہے یعنی

اس سے پہلے فلاں حکومت اور قدرت کا مالک تھا اب اس کی غیبت میں فلاں شخص کی بعنوان جانشینی معرفی کی جاتی ہے۔

اس صورت میں ----- ظاہراً" اس طاقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ارادہ اور شعور پر مشتمل ہے۔ اور یہ بات بعید نہیں ہے کہ موجودہ انسانیت یا باقی موجودات پہلے والوں کی طرح ہیں۔ یعنی جس طرح وہ زمین پر حکومت اور قدرت رکھتے تھے اب انسان بھی اسی طرح سے حاکم اور قادر ہے۔ بعض مفسرین نے اسی مطلب پر درج ذیل آیت کو شاہد قرار دیا ہے۔

"قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدماء" (بقرہ/۳۰)

انہوں نے کہا کیا تو زمین پر اسے خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا

وہ کہتے ہیں ------ کہ فرشتوں کو کیسے پتہ تھا کہ اللہ تعالیٰ زمین پر خلیفہ بنانا چاہتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے کہا تو زمین پر فساد پھیلانے والوں اور خونریزیاں کرنے والوں کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے؟ انہوں نے کہا ہے کہ:

ذہنی طور پر فرشتے ایک مخلوق سے آشنا تھے جنہوں نے زمین پر فساد اور خونریزیاں کی تھیں۔ اسی لئے تو انہوں نے فساد اور قتل و غارت کی بابت نقطۂ اعتراض اٹھایا۔

قوی احتمال یہ ہے کہ فرشتوں نے **فی الارض** سے ہی آنے والی مخلوق کی فساد گری اور خونریزی کو سمجھ لیا تھا۔ یعنی یہ مخلوق چونکہ خاکی جنبہ رکھتی ہے لہٰذا اس کا مادی تعلق اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ آپس میں تنازع اور جنگ وجدال کریں گے۔

البتہ یہاں ہم اس مسئلہ کی تفصیلات کو بیان کرنا نہیں چاہتے۔ فقط اجمالاً" اتنا ضرور کہتے ہیں کہ اگر مقصود ایسے ہی ہو جیسے بیان ہو چکا ہے تو پھر بھی اس سے خلافت

الٰہی کی بابت استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اس لئے کہ ----- حضرت آدمؑ ان تمام موجودات کے خلیفہ تھے جو زمین پر تھے۔ اور جو حاکمیت' ارادہ قدرت تصرف رکھتے تھے اور جس وقت لوگ آپس میں تنازع و جنگ کرنے لگے تو اس وقت معلوم ہوا کہ یہ سب موجودات مجبور اور محکوم نہیں ہیں بلکہ بااختیار ہیں البتہ! ممکن ہے کہ یہ دوسرا احتمال ضعیف ہو۔

اب ہم پہلے احتمال کی طرف واپس پلٹتے ہیں اور **انی جاعل فی الارض خلیفہ** سے خلافت الٰہی کا استفادہ کرتے ہیں۔ جو آیات مسئلہ خلافت کو بیان کرتی ہیں ان میں سے ایک یہ آیت ہے:

"**وھوالذی جعلکم خلائف الارض**" (انعام/۱۶۵)

اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفہ قرار دیا ہے۔

اس آیت میں بھی کلمہ خلیفہ' خلائف استعمال ہوا ہے۔

اس آیت میں انسان کے لئے نعمت اور احسان کو بیان کیا گیا ہے ---- مسئلہ خلافت سے انسان کے لئے ایک فوق العادہ اہمیت کا نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے ------- کہ معمولاً" جانشینی کا مسئلہ حاکمیت کے زمرہ میں آتا ہے۔ بنابریں انتقال قدرت ایک قسم کی حکومت کی بابت امانت الٰہی ہے۔ پس انسان صاحب قدرت اور حاکمیت ہے۔ یعنی زمین پر حکومت کرنے کی قدرت' اور یہ انسان کے لئے ایک بہت بڑا شرف اور فوق العادہ امتیاز ہے۔ خصوصاً" وہ نسبت جو اسے خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہے اسے حیوانی اور مادی جنبہ سے دور کرتی ہے۔ انسان کی شخصیت کے شعار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے تعبیر کرتے وقت خلیفہ کے عنوان سے معنون قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ تسخیر و تصرف

قرآن مجید میں انسان کے بارے میں دوسری تعبیر جس کے ذریعے انسان کی تصویر اتاری جاسکتی ہے ------ تعبیر بعنوان تسخیر ہے۔ ان میں سے ایک مورد میں ارشاد ہوتا ہے۔

وسخرلکم اللیل والنہار (ابراہیم/۳۳)

اللہ نے (اے انسان) تمہارے لئے رات اور دن کو مسخر کیا ہے۔

وسخرلکم الشمس والقمر دائبین -----" (ابراہیم/۳۳)

اللہ نے (اے انسان) تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔

" ------ **وسخر لکم الانہار**" (ابراہیم/۳۳)

اللہ نے (اے انسان) تمہارے لئے نہروں کو مسخر کیا ہے۔

اس قسم کے موضوعات پر مشتمل اور بھی بہت سی آیات قرآن مجید میں ہیں تسخیر یعنی تسلط اور قدرت تصرف یعنی انسان اپنے طبعی قویٰ کے ساتھ ان چیزوں پر حاکم اور متصرف اور تسلط رکھتا ہے اور ان تمام تسخیروں کا میزان ارادہ ہے جس سے اس کا موضوع واضح اور گسترده ہو جاتا ہے۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ ------ انسان ان طبعی (سورج وغیرہ) چیزوں کی محکومیت اور مجبوری کی کیفیت کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جاتا ہے اور نہ صرف آزادی پاتا ہے بلکہ ان پر جبار، تسخیر کنندہ اور متصرف بن جاتا ہے۔ یہ بھی ایک فوق العادہ امتیاز ہے جسے قرآن نے انسان کے لئے بیان فرمایا ہے۔

اس بارے میں اور بھی آیات ہیں جن میں سے چند ایک کو ہدیہ کرنے کی

سعادت ہمارے شامل حال ہے۔

"ھوالذی جعل لکم الارض ذلولا" فامشوا فی مناکبھا و کلو امن رزقه والیه النشور" (ملک/۱۵)

وہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے نرم (و ہموار) بنایا۔ تم اس کے اطراف و جوانب میں چلو پھرو اور اس کی دی ہوئی روزی کو کھاؤ۔ پھر اسی کی طرف (قبر سے اٹھ کر) جانا ہے۔

بنا بریں ----- انسان کے لئے زمین کو نرم اور ہموار بنانے والی تعبیر ہی مسئلہ تسخیر ہے۔ اور سورہ ہود آیت ۶۱ میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے ----- "-------

ھوانشاء کم من الارض واستعمر کم فیھا -----"

اللہ تعالیٰ تمہیں زمین سے وجود میں لایا اور اب تم سے اس کی آباد کاری چاہتا ہے یعنی ایک قسم سے زمین میں دگرگوں کیفیت کو وجود میں لے آؤ۔ البتہ ! یہ کام ایسا ہو کہ اس سے انسانی زندگی میں تکامل پیدا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ اس سے ایک مجبور شخص کو ایجاد کیا جائے اور یہ کیفیت اس کے سقوط اور تباہی کا باعث بن جائے۔

اور وہ کیفیت جو تکامل کا سبب ہے اس میں قوت ارادی اور قوت تصرف کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اصولا" لغت میں استعمار کی تعریف آباد کاری کی جستجو اور کوشش ----- کی جاتی ہے۔ اس کے لئے بھی قوت ارادی اور قوت تصرف سے استفادہ کرنا پڑے گا اور اس سے تکامل پیدا ہوتا ہے اور انسان آگے بڑھتا ہے۔

(مستکبر بن حکومتیں اپنے ساتھ استعمار (آباد کار) کی اصطلاح کو لگانی بیٹھیں۔ اور بعد میں معلوم ہوا ہے کہ یہ تو تخریب کار ہیں بلکہ انہوں نے لفظ استعمار کو استعمار زدہ اور مسخ کر دیا ہے۔)

۳۔ انسان میں جذبہ الٰہی و ملکوتی

انسان کے لئے تیسرا موضوع جس کی بابت قرآن مجید میں ذکر وارد ہوا ہے ------ انسان کا ملکوتی اور الٰہی پہلو ہے۔ بایں معنی کہ بے شک بلا استثنا تمام بنی آدم میں یہ پہلو موجود ہے خواہ پیغمبر ہوں یا امام ہوں یا کوئی عام انسان' بلکہ یہ انسان کے عناصر وجود کا حصہ قرار پائے ہیں۔ یعنی یہ لعاب کی مثل نہیں ہے کہ اسے انسان منہ میں بناتا ہے بلکہ انسان کی شخصیت کی تکوین اور اس کی ذات کے اندر یہ جذبہ ملکوتی و الٰہی رکھا گیا ہے۔ اس مطلب کا ذیل میں چند آیات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

"ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين ------- ثم انشاناه خلقا آخر -----" (مومنون/۱۲'۱۴)

اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ------ پھر اسے (روح ڈال کر) ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔

یعنی یہ خلقت اور ہے اور نطفہ' علقہ' مضغہ' ہڈیوں اور گوشت والی خلقت اور ہے۔ اور صاف سی بات ہے کہ وہ خلقت جو ان نطفہ و علقہ ------ کے علاوہ ہے وہی جذبہ ملکوتی و الٰہی ہے۔ خصوصا" اسی آیت کے آخر میں بیان ہوا ہے **فتبارک اللہ احسن الخالقین** اللہ تعالٰی بہترین خلق کرنے والا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

"ثم سویہ و نفخ فیہ من روحہ" (سجدہ/۹)

(پھر(اس کے پتلے) کو درست کیا اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔

نیز فرمایا:

"فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعواله ساجدین" (حجر/۲۹

پس جب اسے درست کر لوں اور اپنی طرف سے اس میں روح پھونک لوں تو تم سب سجدہ ریز ہو جانا۔

پس یہ آیات صراحتاً" دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تکوین میں ایک جنبہ الٰہی بھی رکھا ہے۔

انسان میں بعد الٰہی اور مادیت کا جنبہ

کبھی کبھی کہا جاتا ہے کہ ------ انسان میں مادی جنبہ اس کے بعد الٰہی والے پہلو کے ساتھ متضاد ہے۔ اور یہ دونوں بعد انسان کو اپنی اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ یعنی مادی جنبہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور ملکوتی جنبہ معنویت اور عالم بالا کی طرف کھینچتا ہے۔ اسے انسان کا مادی اور روحانی پہلو بھی کہا جاتا ہے۔ اور مادیت اور روحانیت دونوں کا آپس میں تضاد ہے۔

ان کی ایک اور بھی تعبیر اور تفسیر ہے:

یہ انسان کے تعامل کی، حرکات کے مراحل کی صورت میں شناختہ شدہ ہے۔ یعنی یہاں تضاد درکار نہیں ہے بلکہ یہاں مراحل کی صورت نکالی گئی ہے جو یوں ہے:۔

سب سے پہلے خاک' پھر بتدریج مادی جنبہ اور اس کے ساتھ محبت اور وابستگی اور شہوت نفسانیہ کا پہلو ------ اس کے بعد تکامل معنوی و روحانی کا پہلو سامنے آتا ہے جس کی طرف انسان پرواز کرتا ہے۔ اور جوں جوں تکامل اور پرواز میں شدت پیدا ہوتی ہے اور نقطہ سقوط سے دور ہو جاتا ہے تو یہاں اس سے مادیت کا تعلق اور

وابستگی کٹ کر رہ جاتی ہے اور اس کی روحانیت کی پرواز اللہ تعالیٰ (کی رحمت) کی جانب تیز ہو جاتی ہے۔

البتہ

ہم اسے بیان کرنے کے مورد میں نہیں ہیں ----- لیکن ہمارے ذہن میں اتنا ضرور ہے کہ انسان کے اندر تضاد کی کیفیت ہے اور وہ نفس اور عقل کے درمیان ہے جس سے شیطان اور فرشتہ' شیطانی وسوسوں اور پیغمبروں کے الہاموں اور اللہ تعالیٰ کی وحی کے درمیان نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ مسئلہ قابل مطالعہ ہے۔

کیا اشکال ہے کہ ہم اس خاکی پہلو کو انسان کی پہلی حرکت قرار دیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت اور مقام پانا دقیق ہے۔ اگر اللہ کی ہدایت کسی کے شامل حال ہو تو ان تمام مادی' بدنی' خوردنی کیفیتوں کے باوجود ہونی چاہئے۔ یہیں سے روحانی ارتقا کی منزل شروع ہوگی جس سے انسان روحانی بن جاتا ہے۔

لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس حرکت میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت وجود رکھتی ہو۔ یعنی انسان تبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سفر اور پرواز کرے گا جب وہ ہدایت کے راستہ پر گامزن ہوگا۔ اور پھر وہ گمراہی جو ہدایت سے انحراف کا نام ہے ----- سے دور ہو جائے گا۔ یہ سب مراحل ہیں - ----- ایسے نہیں ہے کہ جنبہ مادی اور روحی کے درمیان تیزی کے تابع ہیں کہ اگر مادی پہلو غالب آجائے تو انسان زمین بوس ہو جائے گا اور بحار الانوار جلد ۷۳ ص ۱۷۰ میں ہے کہ **اکثر مصارع القول تحت بروق المطامع** جب انسان حریص اور لالچی ہوتا ہے تو اسکی عقل زمین بوس ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی ہم کہتے ہیں کہ ---- نہ ----- اصلا" یہ خاکی اور مادی حالت انسان میں وجود رکھتی ہے اور مختلف مادی عزیزوں پر مشتمل ہے۔

یعنی

حب ذات (اپنی ذات کو چاہتا ہے)

کھانے پینے کو پسند کرتا ہے۔

جنسی شہوانی ملاپ کو پسند کرتا ہے

جاہ اور مقام کو پسند کرتا ہے ----- مادی پہلو ہیں جو انسان کے ساتھ مربوط ہیں۔

روحانی جنبہ کے بھی مراحل ہیں۔

یعنی!

کمال پانے کے ساتھ عشق رکھتا ہے۔

آگاہی پانے کے ساتھ عشق رکھتا ہے۔

عالم بننے کے ساتھ عشق رکھتا ہے۔

حق شناسی چاہتا ہے۔

حق حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔

بنابرین ----- حق طلبی ، کمال طلبی، علم دوستی ------- سب انسان کے روحانی معنوی ملکوتی جنبہ ہیں۔

کھانے پینے کی محبت، گھر کی خوبصورتی سے محبت، شہوت رانی، آرام طلبی یہ سب انسان کے مادی و خاکی جنبہ ہیں۔

اگر ان روحانی اور مادی چیزوں کو باہم جمع کیا جائے تو انسان تضاد کی کیفیت سے دوچار ہو جائے گا۔ یعنی اگر کوئی شخص غذا کے ساتھ محبت رکھتا ہو تو سارا دن اسی کو حاصل کرنے میں لگا رہے گا اور نتیجتاً اسے غذا مل جائے گی اور وہ اسے تناول

کرے گا لیکن اس کا روحانی پہلو تشنہ رہ جائے گا

لہٰذا انسان انہی پہلوؤں کا مجموعہ ہے۔ اس کا اور اس کی کیفیات کا آپ جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ غریزہ، سائقہ، مفاد، کشش، جاذبہ جو چاہے تعبیر کریں۔ واضح رہے کہ ان میں سے کچھ کا تعلق روحانی، الٰہی، ملکوتی جنبہ کے ساتھ ہے اور کچھ کا تعلق مادی، خاکی جنبہ کے ساتھ ہے۔ پس ہدایت اور عملی ہم آہنگی سے انسان اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرتا ہے اور پست چیزوں کے بجا لانے سے اللہ تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہدایت ٹھیک پیمانے پر نہ تھی اور تعادل برقرار نہ تھا۔ اس نے صحیح سمت کی طرف توجہ نہ دی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان جس قدر مادیت اور مقام طلبی میں گھر جاتا ہے اسی قدر خداوند تعالیٰ سے دور ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں معنویت کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ انسانیت سے عدول کرکے حیوانیت کے زمرہ میں آجاتا ہے جن کا ہم و غم صرف اور صرف کھانا پینا ہے۔ کیونکہ اسے سوائے کھانے، چرنے اور شہوت خواہی کے کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔

اور اگر وہ انسان اپنی خواہشات نفسانیہ کی مخالفت کرے تو وہ خداوند تعالیٰ کی رحمت کی طرف پرواز کرکے جنت میں داخل ہوسکتا ہے۔

"واما من خاف مقام ربه و نهی النفس عن الهوٰی فان الجنة هی الماوٰی" (نازعات/۴۰،۴۱)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے ڈرے اور اپنے نفس کو خواہشات سے بچائے تو اس کا ٹھکانا جنت کو قرار دیا گیا ہے۔

کیا یہ مبارزہ انسان کے تکامل کا باعث بنتا ہے یا صحیح ہدایت اور ان تمام طبیعیات

کا مجموعہ انسان کو تکامل کی طرف کھینچتا ہے؟

اس بحث میں اشارہ کرتا ہوں کہ ------- وہ تعبیرات جو دور حاضر کے مصنفین نے کی ہیں' ان میں کبھی کبھی اس مسئلہ کو یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ انسان میں آدھا جنبہ خدائی اور آدھا جنبہ خاکی ہے۔ کبھی عرفانی تعبیر سے بیان کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی درست توجیہ نہیں کی گئی۔ نتیجتاً" بعض کا تو یہ خیال تھا کہ چونکہ انسان کا ایک جز خدائی ہے لہٰذا وہ خدا ہے۔ یہاں ایک نقطہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ روح الٰہی یا تجلی الٰہی انسان میں پائی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اللہ کا انسان میں حلول ہوگیا ہے کیونکہ انسان مخلوق اور اس کی ذات سے جدا حیثیت رکھتا ہے۔

انسان ممکن الوجود اور اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ انسان فانی' محدود اور ناقص ہے۔ اور یہ جو ہم اللہ کی روح یا اللہ کی پھونک کہتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان آدھا خدا اور آدھا شیطان ہے۔ یعنی انسان کو خدا اور شیطان سے مرکب نہ سمجھا جائے۔ بلکہ تمام چیزیں وجود میں آنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرہون منت ہیں۔ زندگی' موت' رزق سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی روح کا مطلب یہ ہے کہ ------ روح الٰہی یعنی نعمت الٰہی' احسان الٰہی' اور روح کا عالم ماورا کے ساتھ تناسب ہے۔ اور مجرد ہے اور عالم ملکوتی کے ساتھ متعلق ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ کی روح اس کی ذات سے جدا ہو کر انسان کے اندر داخل ہوگئی ہے۔

۴۔ انسان کی زندگی کے اہداف اور مقاصد

قرآن مجید میں مذکور چوتھا مسئلہ ------- جس میں انسان کی بابت ذکر وارد

ہوا ہے وہ انسان کی ہدف داری ہے۔ یعنی:

قرآن مجید میں انسان کے بامقصد اور ہدف دار ہونے کے مسئلہ پر تاکید کی گئی ہے۔

سورہ قیامت' آیت ۳۶ میں ارشاد پروردگار ہے۔ **"ایحسب الانسان ان یترک سدی"**

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

سورہ مومنون آیت ۱۱۵ میں ارشاد پروردگار ہوتا ہے:

"افحسبتم انما خلقنا کم عبثا و انکم الینا لا ترجعون"

کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا ہے اور تمہاری بازگشت ہماری طرف نہیں ہوگی۔

یعنی!

کیا تمہارا خیال ہے کہ اس زندگی میں تمہیں شتر بے مہار کی طرح بغیر مقصد کے خلق کیا گیا ہے۔ اور تمہاری خلقت کا کوئی ہدف نہیں ہے؟ اور اگر زندگی کا کوئی ہدف ہے تو وہ کیا ہے؟ یہ بھی بذات خود ایک مسئلہ ہے۔

قرآن مجید میں کئی مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی زندگی کا ہدف خدا کی رحمت کو پانا اور اس کی جانب تکامل کی منازل کو طے کرنا ہے:

"ولله ملک السموٰت والارض والی اللّٰہ المصیر" (نور/۴۲)

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور تمام لوگوں کی بازگشت اللہ کی جانب ہے۔

"ومن تزکی فانما یتزکی لنفسه والی اللّٰہ المصیر" (فاطر/۱۸)

جو اپنا تزکیہ نفس کرے تو اس کی سعادت اس کے اپنے ہی لئے ہے۔ اور تمام لوگوں کی بازگشت اللہ کی جانب ہے۔

تزکیہ اور خود سازی کے بعد الی اللّٰہ المصیر کی عبارت کو ذکر کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف سفر اور پرواز کا آغاز کیا گیا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد پروردگار ہے :

"یا ایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیہ" (انشقاق/۶)

اے انسان تو اپنے پروردگار کی حضوری کی کوشش کرتا ہے۔ تو (تو ایک نہ ایک دن) اس کے سامنے حاضر ہوگا۔

رنج و ملال اور کوشش کے بعد خودسازی اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہوگی

ایک اور آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ :

"فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملا" صالحا" ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا" (کہف/۱۱۰)

جو شخص اپنے رب کی ملاقات کا متمنی ہے اسے چاہئے کہ نیک اعمال بجا لائے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اسی طرح سورہ حدید آیت ۵ میں بیان ہوا ہے:

لہ ملک السمٰوات والارض والی اللّٰہ ترجع الامور"

اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اور تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

نیز ارشاد ہوا :

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" (ذاریات/۵۶) میں نے جنوں

اور انسانوں کو صرف اور صرف اپنی عبادت کی خاطر پیدا کیا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد رب العزت ہوا ہے:

"**انا للّٰہ وانا الیہ راجعون**" (بقرہ/۱۵۶)

ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی طرف پلٹ جانا ہے۔

نیز:

"------- **وان الی ربک المنتھٰی**"

تمام مخلوق کے کام اللہ ہی طرف منتہی (انتہا) ہوتے ہیں۔

اس موضوع (کہ تمام چیزوں کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے) کی بابت بہت زیادہ آیات ہیں۔

یہ مسئلہ تمام کائنات کے اندر وجود رکھتا ہے۔ لیکن اسے یوں تحلیل کیا جائے کہ عالم وجود میں ایک انسان جزئی موجود ہے جو کل عالم وجود و ہستی سے ماخوذ ہے۔ اور اس کی انتہا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اور وہ موجودات جو انسان کی طرح شعور، قدرت، ارادہ، آزادی رکھتے ہیں ان کی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف بازگشت ہوگی۔

باقی مخلوقات کا اللہ کی طرف پلٹنا اسی معیار کی بنا پر ہے ------ مثلاً" پہاڑ فی حدذ اتہ حرکت نہیں کرسکتا۔ البتہ بعض موجودات میں حرکت وجود رکھتی ہے۔ اور وہ بھی بغیر مقصد کے معرض وجود میں نہیں آئے۔ ایک فلسفی تحلیل میں کہا جاتا ہے ------ اگر یہ اللہ کی طرف والی حرکت اس دنیا میں موجود تمام موجودات میں پائی جائے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ تکامل نہائی کے مالک ہیں۔ جب یہ تمام کے تمام اپنے اپنے موجودات کو پرورش دینے میں باشعور ہیں تو وہ موجود جو باشعور ہے یا جنبہ ملکوتی رکھتا ہے تو اس کے اندر ایک ہمیشہ ختم نہ ہونے والی حرکت پیدا ہو جاتی

ہے۔

خصوصاً" جب ہدف اور مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو تو اس حرکت میں وقفہ موجود نہیں ہو گا۔

ایک نقطہ جو تمام جہان خصوصاً" انسان کی بابت محسوس کیا جاتا ہے ----- یہ ہے کہ :

اسلام کی نگاہ میں انسان وہ ہے جس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی ہدف اور مقصد ہو۔ اسلام انسان کو ایسی اہمیت عطا کرتا ہے کہ اس کی تکوین اولی اللہ تعالیٰ کی پھونک ہے اور انسان کے لئے ایک ختم نہ ہونے والی حرکت اور انتہا کے قائل ہیں۔

اس بالا تر انسان کے لئے کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں ------ انسان کے تکامل کی حرکت محدود نہیں ہے۔

البتہ!

اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ خدا بن گیا ہے۔ لیکن انسان کا یہ سفر اور پرواز متوقف نہیں ہوتی کہ وہ کسی جگہ پر منقطع ہو جائے کیونکہ اگر یہ کسی جگہ پر منقطع ہو جائے تو وہ انسان خدا بن جائے گا جو خدا بن نہیں سکتا ------ اور یہ حرکت ختم نہ ہونے والی ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا یہ تکامل مرنے کے بعد جنت میں بھی جاری رہے گا ---- ضروری ہے کہ کہا جائے قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی سے پتہ چلتا ہے کہ جس شخص کے پاس یہ صلاحیت ہوئی مرنے کے بعد جنت میں بھی یہ تکامل کی حرکت جاری رہے گی۔

"----- **واللہ یضاعف لمن یشاء** ----" (سورہ بقرہ آیت ۲۶۱)

اللہ جس کے لئے چاہے دوگنا کر دیتا ہے۔

"وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم" (سورۃ آل عمران آیت ۱۳۳)

اپنے رب کی مغفرت کی طرف جلدی کرو۔

"------فاستبقوا الی الخیرات" (سورہ مائدہ آیت ۴۸)

نیکی کرنے میں جلدی کرو۔

اگر دنیا میں کوئی شخص نیکی اور مغفرت میں جلدی کرتا ہو تو مرنے کے بعد بھی اسے جاری رکھے گا۔

البتہ!

انسان آخرت کے حوالے سے اپنے لئے کسی قسم کی حرکت کو ایجاد یا حاصل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اسے عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن وہ کام جو دنیا میں کرتا ہے انہیں جنت میں بھی کرسکتا ہے۔ اس لئے چند اچھے آثار ایسے ہیں جو مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے مثلاً" وہ نیک عمل جو دنیا میں چھوڑ آیا ہے وہ مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے۔

جو کتاب لکھ کر دنیا میں چھوڑ آیا ہے وہ بھی مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ جاری رہے گی۔

وہ بچہ جس کی دنیا میں تربیت کرکے آیا ہے۔

وہ شاگرد جس کی دنیا میں تربیت کرکے آیا ہے۔

آثار خیریہ جو اپنے لئے دنیا میں چھوڑ آیا ہے۔

یہ سب امور جاری رہیں گے اور بنیاد رکھنے والے کو ثواب اور اجر ملتا رہے گا۔

اذامات الانسان انقطع عملہ الامن ثلاث : الامن صدقۃ جاریۃ او علم

ينتفع به او ولد صالح يدعوله (کنز العمال)

چنانچہ روایت میں وارد ہوا ہے۔

"**من سن سنة حسنة فله اجر من عمل بها**"

جو شخص کسی نیکی کی بنیاد ڈالے تو اسے اس پر عمل کرنے والے جتنا ثواب ملتا رہے گا۔

یعنی :

وہ تکامل اور اجر و ثواب کی حرکت جو دنیا میں جاری ہوئی ہے منقطع نہ ہوگی بلکہ جاری وساری رہے گی۔

۵۔ فطرت انسان

پانچواں موضوع جو انسان کے لئے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے مسئلہ فطرت ہے۔ انسان کی یہی خاصیت ہے کہ وہ قوانین تشریعی الٰہی کے ماتحت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح خلق فرمایا ہے کہ وحی الٰہی کے چشمے اس کے اندر پھوٹتے ہیں۔ وہ وحی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برگزیدہ انسانوں پر نازل ہوتی ہے -------- انسان پر منطق ہوتی ہے۔ اور فطرت تمام حقائق کو حاصل کر لیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد پروردگار ہے :

"------**فطرة اللّٰه التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق اللّٰه ذلک الدین القیم**------" (روم/۳۰)

یہی اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اور خدا کی بنائی ہوئی فطرت میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا اور یہی مضبوط اور (بالکل سیدھا) دین ہے۔

فطرت خدا ہی دین قیم ہے ----- البتہ!

اگر اس آیت کے ساتھ سورہ شمس کی آیت کو بیان کیا جائے تو مطلب واضح ہو جائے گا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو بصیرت، ہوشیاری اور آگاہی دے رکھی ہے۔ ایسی بصیرت عطا کی ہے کہ اس سے حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز کر سکتا ہے۔

"فالھمھا فجورھا و تقوھا" (شمس/۸)

(نفس کو) برائی اور نیکی کا الہام کر دیا ہے۔

یہ ان معلومات کے علاوہ ہیں جو درس و تدریس سے حاصل ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ ایسی آگاہی ہے کہ جسے انسان اپنے نفس کے اندر پاتا ہے ------ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ فطرت اللہ تعالیٰ کی وحی کے فیض کا مظہر ہے جس سے کوئی شخص بے بہرہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اچھا ہے کہ انسان وحی کے ساتھ مانوس ہو۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے انسان سے کوئی شئے گم ہوگئی ہو اور وحی اس کی نشاندہی کرتی ہے اس مسئلہ کی تقویت کے لئے قرآن مجید میں دو قسم کی تعبیریں اور بھی ہیں۔

ا۔ انبیا کے مورد میں مسئلہ تذکر (یاد دہانی):

"فذکر انما انت مذکر" (غاشیہ/۲۱)

(اے رسول) لوگوں کو یاد دہانی کرا دو کیونکہ تُمھارا پیغمبری وظیفہ اس تذکر کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

وحی ----- یاد دہانی ہے۔

یعنی:

انسان ایک مطلب کو جانتا تھا اب بھلا چکا ہے ---- بعد میں اسے یاد کرے تو از سر نو تعلیم نہیں ہوگی بلکہ تذکر (یاد دہانی) ہے۔ اگر کوئی شخص پہلے کچھ نہ جانتا ہو

بعد میں یاد کرے تو یہ تذکر نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیا کی تعلیم کی ایک بنا ہے اور انبیا کا صرف یہ کام ہے کہ وہ پردہ اور حجاب کو ہٹاتے ہیں۔ اور اس غبار کو جھاڑتے ہیں جو لوگوں کے اندر موجود باتوں پر ہوتا ہے۔ یہ انسان کو ایک پاک صاف عالم کی طرف لے جاتے ہیں۔ بنا بریں انسان کو اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ اگر اس کی فطرت آلودہ نہ ہو اور ہوا و ہوس اس پر غلبہ نہ پائیں اور آداب و سنت میں غلطی نہ کرے تو ہر مورد میں علم و آگاہی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

۲۔ اس موضوع (فطرت) پر قرآن میں بعنوان عالم ذر ایک تعبیر موجود ہے۔

"------ **واشهد هم علٰی انفسهم الست بربکم قالوا بلٰی**" (اعراف /۱۷۲)

اور انہیں اپنے اوپر گواہ بنایا: کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ ان سب نے کہا: ہاں

(عالم ذر سے مراد خلقت ارواح کا عالم ہے۔)

ایک اور مقام پر انہیں اللہ تعالیٰ کی بابت یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ گویا کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں ایک خدا ہے۔ اور یہ جہان ایک عالم الغیب ہستی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور ایک خدا کے ہی ساتھ مربوط ہے۔

البتہ!

ہم یہاں عالم ذر کی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے۔ مختصر بات یہ ہے کہ:

انسان کی قدر و قیمت توحید اور اس کی جانب متوجہ ہونے کی بنا پر ہے۔ لہٰذا انبیاؑ نے جو توحید کی تعلیم دی ہے وہ یاد دہانی اور لوگوں کو ہوشیار کرنے اور بیدار کرنے

------ کی بنا پر تھی۔ کیونکہ لوگ خواب غفلت میں گرفتار ہیں پس اس فطرت کی طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کی بحث کو نادیدہ قرار دے کر اس کے پاس سے سادگی سے گزر جانا صحیح نہیں ہے۔

۶۔ علم و آگہی پر قدرت۔

قرآن مجید میں انسان کی بابت چھٹا موضوع ---- علم و آگہی پر قدرت ہے اس موضوع کے بارے میں بہت زیادہ آیات وارد ہوئی ہیں۔ لیکن وہ آیات بہت کم ہیں جن میں علم کی استعداد کو بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں سے ایک یہ ہے:

واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئا و جعل لکم السمع و الابصار والا فئدۃ لعلکم تشکرون۔ (نحل/۷۸)

اللہ ہی ہے جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا اس حال میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے قرار دیا تمہارے کان، آنکھ، دل کو تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

لاتعلمون شیئا سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جب پیدا ہوا تھا تو اس وقت تعلیم و تعلم کے ذریعے حاصل ہونے والی اکتسابی معلومات سے بے بہرہ تھا۔ اور ساتھ ساتھ اسے علم حاصل کرنے کے وسائل (آنکھ، کان، دل) عطا کر دیئے گئے۔

افئدۃ فواد کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں اور دل ہی روح، قدرت تفکر، قدرت تعقل ہے۔ فواد اس محل کا نام ہے جہاں ذہن میں آئی ہوئی آگاہی پختہ اور محکم ہوتی ہے۔ یہاں پر ان آگاہیوں کا خمیر تیار ہوتا ہے اور انہیں باہم مرکب کیا جاتا ہے۔ جس سے ترو تازہ آگاہیاں حاصل ہوتی ہیں۔

البتہ!

ہماری بحث دل کے بارے میں نہیں ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ اس کی طرف اجمالاً" اشارہ کر دیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمات (کان' آنکھ' دل) انسان کے لئے کیونکر بنائی ہیں؟

لعلکم تشکرون اس لئے تاکہ ان کے مقابلے میں لوگ شکر گزار بن جائیں قرآن مجید کی اصطلاح کے مطابق شکر اس نعمت کو استعمال کرنے کا نام ہے جو نعمت اس کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور شکر بھی نعمت ہے۔

قرآن مجید میں بہت زیادہ شواہد موجود ہیں جن میں اس موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ بنا بریں انسان کو اللہ تعالیٰ نے کان' آنکھ' قوت تفکر عطا کی ہے تاکہ وہ شکر گزار بن جائے۔ یعنی ان سے وہ کام لے جن کے لئے انہیں بنایا گیا ہے۔ تاکہ **لاتعلمون شیئا** کا جبران ہو سکے۔ (اس لئے کہ پہلے انسان کچھ نہیں جانتا تھا اب کان' آنکھ' دل کو استعمال میں لانے کے بعد عالم بن گیا ہے اب تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔)

چند ایک اور آیات بھی ہیں:

"**وعلم ادم الاسماء کلها**------" (بقرہ/۳۱)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تمام کے تمام اسما کی تعلیم دے دی۔

"**علم الانسان مالم یعلم**" (علق/۵)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسے وہ نہیں جانتا تھا اسکی تعلیم دے دی۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں مسئلہ تعلیم و آگاہی اور علم کے حصول کی تشویق کو انسان کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

بنا برایں ------ انسان کی وہ خصوصیات جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک علم کی دولت اور آگاہی پر قدرت سے بہرہ ور ہونا ہے۔

۷۔ راستہ کے انتخاب میں آزاد اور خود مختار ہے۔

ساتواں موضوع جو قرآن مجید میں انسان کے لئے بیان کیا گیا ہے وہ کسی کام کے انتخاب میں آزادی اور خود مختاری کا مسئلہ ہے اور یہ انسان کی خصوصیات میں سے عظیم ترین خصوصیت ہے۔ اس مسئلہ کی بابت قرآن مجید میں بہت زیادہ تاکید وارد ہوئی ہے ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔

"**وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر** (کہف/۲۹)

اے حبیب کہہ دو حق وہی ہے جو تمہارے رب نے بیان کیا ہے اب جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر بن جائے۔

"**انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا**" (دہر/۳)

ہم نے انسان کو صحیح راستہ کی ہدایت کر دی ہے خواہ وہ شکر گزار بن جائے اور خواہ ناشکرا بن جائے۔

یہاں دو دفعہ لفظ "اما" کو استعمال کیا گیا ہے جو دلالت کرتا ہے کہ راستہ کو منتخب کرنے میں انسان خود مختار ہے اس پر کوئی جبر نہیں ہے۔

"**انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه فجعلناہ سمیعا بصیرا**" (دہر/۲)

ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں تو پس ہم نے اسے سنتا دیکھتا بنایا۔

اس آیت مجیدہ میں لفظ "**امشاج**" انسان کی ابتدائی (مخلوط نطفہ' علقہ' مضغہ) کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور احتمال قوی کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں سے انسان کے جنبہ مادی اور جنبہ روحانی کی طرف اشارہ ہے اور انسان کو ان دونوں میں سے ایک راستہ کے انتخاب میں اختیار دیا گیا ہے۔ یعنی انسان ایک جنبہ کی بنا پر پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس میں دونوں پہلو ہیں اس لئے کہ اگر ایک جنبہ کو ہی انسان کے لئے قرار دے دیا جائے تو اس سے جبر لازم آئے گا۔

اب جب انسان کی اصلیت نطفہ امشاج کو قرار دیا گیا ہے تو روحانی جنبہ اسے اپنی طرف اور مادی جنبہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لہٰذا انسان ان راستوں کے اوپر کھڑا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے کسی ایک راستہ کے انتخاب کا اختیار دیا ہے --- اور اسی کے ذریعے اس کا امتحان اور آزمائش کر رہا ہے۔ اور اگر ایک ہی راستہ ہوتا تو امتحان اور آزمائش کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور انسان اسی خاص سمت کی طرف گامزن رہتا۔

بنا بریں ----- سمیع و بصیر ہونے کے بعد **ھدیناہ السبیل** (راستہ کی ہدایت) واقع ہوئی ہے۔ اب کان آنکھ کے باوجود مادی جنبہ انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور روحانی جنبہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث آئندہ ----- کی مباحث میں بیان کی جائے گی کہ قرآن مجید انسان کے اوج کو کتنا بیان کر رہا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ مکتب انسان کی اہمیت اور قدر و قیمت کا قائل ہے ----- اسے ناسزا قرار دیا گیا ہے۔ یہ مکتب انسان کے لئے ہر قسم کی آزادی کا قائل ہے۔ اور جب انسان کے صحیح اور غلط راستہ کے انتخاب کا وقت آتا ہے تو اسے تاریک عالم میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں انسان کے پاس اچھے برے میں تمیز کا کوئی معیار و ضابطہ نہیں ہوتا۔

یعنی :

انسان کو ایک تاریک سنگلاخ میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں تو اسے ایک طرف تو جانا ہی ہوتا ہے۔ لیکن اسلام نے کان، آنکھ کے علاوہ اس کی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کا بھی بندوبست کیا ہے۔

اس کے آخر میں فرمایا " **اما شاکرا" و اما کفورا"** " یعنی وہ دونوں راستوں کی کشش کے باوجود اس راستہ کا انتخاب کرنے میں آزاد ہے۔

چاہ است و راہ و دیدہ بینا و آفتاب

تا ہر کسی نگاہ کند پیش پای خویش

سامنے کنواں ہے اور اس کے ساتھ راستہ ہے اور انسان کے پاس آنکھیں بھی ہیں اور سورج کی روشنی بھی ہے اب اپنا قدم سنبھل کر رکھیں

یہ آیت انسان کے لئے صحیح راستہ کے انتخاب کو مشخص کرتی ہے۔ تمام مطالب جن کو ہم نے بیان کر دیا ہے---- ان سے آیت امانت کے بیان کے لئے بنیاد بن گئی ہے۔ اب ہم اسے بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ تمام مسائل اس آیت میں مذکور ہیں۔

انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض و الجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا۔" (احزاب/٧٢)

ہم نے (روز ازل) اپنی امانت کو سارے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا انہوں نے اس کے بار کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے (بے تامل) اٹھا لیا بے شک انسان (اپنے حق میں) بڑا ظالم اور نادان ہے۔

آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے انکار اور انسان کے بار اٹھا لینے کی شاید بہترین تفسیر یہ ہے کہ ----- ان کے مجموعہ کی ماہیت اور شخصی وجود انہیں اٹھانے کی

طاقت نہیں رکھتے تھے لہٰذا ان کی فطرت نے امانت الٰہی کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور امانت کو قبول نہ کر سکے۔ کیونکہ امانت کو وہی اٹھا سکتا ہے جس کی بابت پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یعنی وہ قابلیت رکھتا ہے جس کے پاس فطرت الٰہی (کان' آنکھ اور نفخۂ الٰہی) ہو۔

بنا براں ---- انسان جس میں مافوق سب خصوصیات موجود ہیں وہ امانت الٰہی کو قبول کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ باقی تمام موجودات مثل آسمان' زمین' پہاڑ اگرچہ بہت بڑے ہیں لیکن چونکہ ان میں بار اٹھانے کا ملکہ (فطرت) نہیں ہے لہٰذا وہ انکار پر مجبور ہو گئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ------- وہ امانت کیا چیز ہے؟

شاید ہم کہہ سکیں کہ اس کا ماحصل وہی تشخص اور ارادہ ہے۔ یعنی مسئولیت کا قبول کرنا اور اسے برداشت کرنے کی مسئولیت۔ اور جب اسے سمجھ کر انتخاب کر سکتے ہوں تو اسے قبول کر لینا چاہئے۔

اس مسئولیت کا قبول کرنا تین چیزوں کی بنا پر انسان ہی کے لئے ممکن ہے کیونکہ وہ ان میں پیش رفت کر سکتا ہے اور اس کے علاوہ باقی سب اسے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ خود کو اللہ تعالیٰ کی جانب تکامل کے لئے انتخاب' ارادہ' آزادی کے ساتھ تیار کیا جائے۔

۲۔ طبیعت کو تسخیر کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

۳۔ معاشرہ سے فساد کو دور کرکے طاغوت کے ساتھ مقابلہ کرنے اور نبرد آزما ہونے کی صلاحیت موجود ہو۔

فطرت کی بحث میں اشارتاً" جن نکات کو ذکر کرنا چاہتے تھے بیان ہو چکے ہیں۔ کہ انسان میں ایک جنبہ روحانی اور ایک جنبہ مادی ہے اب لازم ہے کہ اس کی تھوڑی سی تفصیل بیان کی جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ :

انسان کے دو پہلو ہیں۔

(۱) مادی پہلو

(۲) روحانی پہلو

پہلے جنبہ مادی کو قرآن مجید میں مختلف ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً" شح نفس، حریص، ہوا پرست، جہل، ظلم، جلد باز وغیرہ وغیرہ۔

اگر ان کی بابت آیات کو جمع کیا جائے تو تقریباً" دس یا پندرہ مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ ظلوم، جہول، عجول وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف قرآن مجید میں دوسرے جنبہ کی بابت ارشاد ہوا :

"**لقد کرمنا بنی آدم**" بنی آدم کو تکریم عطا کی۔

"**فضلنا هم**" ہم نے انہیں فضیلت عطا کی۔ ؎۱

اس آیت میں **وفضلنا هم کثیر ممن خلقنا تفضیلا** سورہ اسریٰ آیت ۸ کی طرف اشارہ ہے

"**الی اللہ المصیر**" سب کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے (فاطر/۱۸)

"**فتبارک اللہ احسن الخالقین**" (مومنون/۱۴) یہ آیت بھی نفخۂ الٰہی کے ساتھ مربوط ہے۔

ان تمام آیات کے بارے میں ایک تفسیر اور تعبیر وارد کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان تمام تعبیرات میں ایک وجودی بعد کی تجلی ہے۔ اور اس کا انسان کے وجود میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ یہاں ہی انسان اللہ کی امانت کے اٹھانے کو چاہتا ہے۔ اور اس کے

لئے آفت اور ناسور ظلم اور جہالت ہے۔

آفت بایں معنی کہ:

انسان اس کے اٹھانے میں ظلم اور جہالت کے راستہ پر چل نکلے اس صورت میں ظالم بن جائے گا اور جو عدل کے معیار سے خارج ہو جائے اور اس انتخاب اور ارادہ کی قدرت سے جاہل ہو وہ اس نعمت کو ضائع کر بیٹھتا ہے اور کبھی بھی عالم اور صاحب بصیرت نہیں بن سکتا۔ اور صحیح راہ پر چل نہیں سکتا۔

گویا اس نے **وضع الشی غیر موضعه** (شئے کو غیر محل پر رکھا) پر عمل کیا اور ایسا کرنے سے ظلم کی قید میں گرفتار ہوا۔

معیار عدل کے سلسلہ میں جناب امیرالمؤمنین علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

یضع الامور مواضعها" (بحار جلد ۷۵ ص ۳۵)

امور کو ان کی جگہ پر رکھا جائے۔

تعبیر خلق کے مورد میں ارشاد پروردگار ہے:

ان الانسان خلق هلوعا" (معارج /۱۹)

انسان کو حریص پیدا کیا گیا ہے۔

جس طرح انسان مضغہ' علقہ' ہڈیاں ------- سے بنایا گیا ہے اور یہ سب مادی اور خاکی چیزیں ہیں۔ یہ انسان کو مادیت کے عشق میں گرفتار کرتی ہیں۔ اور وہ انسان کہ جس کا سارا بدن انہی خاکی عناصر سے بنا ہوا ہو وہ اس خاکی مادہ 'دولت' شہوت کا عاشق ہوگا۔ اور پھر اس شئے پر فریفتہ ہوگا جس کا مادی جنبہ کے ساتھ تعلق ہے۔

بنا برایں ------ انسان مادہ کا حرص رکھتا ہے۔ لیکن وہی انسان نفخہ الٰہی بھی رکھتا ہے۔ اور جو شخص حرص کے ساتھ مبارزہ کرے گا اسے فلاح اور کامیابی حاصل

ہوگی۔

"--------ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون (حشر/۹)

جو اپنے نفس کو حرص سے بچالے وہی فلاح پانے والا ہے۔

ایک بیج کا دانہ زمین کے اندر مبارزہ کرتا ہے اور اس کا سینہ چیر کر باہر نکلتا اور بلند ہوتا جاتا ہے اس وقت اس کیفیت کو افلح و فلح سے تعبیر کرتے ہیں اسی لئے کسان کو فلاح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اس دانہ کے لئے رشد کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

اگر انسان بھی نفس کے حرص سے بچ جائے تو کامیابی اور فلاح تک پہنچ سکتا ہے وہ دانہ جس نے مبارزہ کرنے کے بعد فلاح پائی ہے وہ اپنی مادیت کو نہیں چھوڑتا البتہ ابتدا میں مٹی کے اندر تھا۔ اگر مٹی کی تسخیر کے لئے مبارزہ نہ کرتا تو فلاح نہ پاتا اور تباہ ہو جاتا۔

لیکن اس نے خاک کے ساتھ مبارزہ کیا اور باہر نکل آیا ہے اور اب دن بہ دن اوپر جا رہا ہے۔ اور عین حال اس کی غذا کا منبع خاک ہے۔

یعنی!

اس نے نہ صرف مادہ کو اسیر کیا بلکہ اسے اپنے ہی تصرف میں رکھا ہوا ہے اور اسی مادہ سے اپنے تکامل کی منازل کو طے کر رہا ہے۔

اب ہم دوبارہ اس بات کی طرف پلٹتے ہیں جو پہلے بیان کی تھی کہ آیا مادی اور روحانی پہلوؤں کے درمیان تضاد ہے

اگر ہم بھی صحیح سمت کی طرف چلیں تو آزادی و فلاح تک پہنچ سکتے ہیں:

"قد افلح المؤمنون" کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے نماز میں ۔

خشوع و خضوع کو بیان کیا ہے اور لغویات سے اعراض کو بھی بیان کیا ہے۔ بطور خلاصہ نفس اور شہوات کے ساتھ مبارزہ کو بیان کیا گیا ہے۔ (مومنون/۱ تا۹)یعنی یہ ارادی اعمال اور نیک حرکت انسان کو مادیت کی قید سے رہائی دلاتے ہیں لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ انسان سے مادیت کو جدا کر دیتے ہیں۔

بلکہ!

مادیت پر حاکم بنا دیتے ہیں۔

یعنی!

یہ سب یوں ہوں کہ کام، مقام، منصب، گھربار، بیوی و رشتہ دار ------ ہوں لیکن یہ سب اس کے تکامل میں معاونت کریں نہ کہ اسے مادیت کا اسیر بنا دیں۔ اور نہ یہ کہ انسان اپنے کو ان کے حوالے کر دے اور ان کا غلام بن کر رہ جائے۔

بلکہ!

ان سب کو اپنے کمال کو پانے کے لئے وسیلہ قرار دے۔ اسی لئے پیغمبر اکرمؐ "**کلمینی یا حمیرا**" کہتے تھے اور حالانکہ انہوں نے ایسا کمال پایا کہ عام انسان اسے درک کرنے سے عاجز ہیں۔

اس بارے میں ہمارا مختصر کلام آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ یہ ابحاث انسان کو دوسرے مکاتب فکر کے مقابلہ میں غنی قرار دیتی ہیں اور انسان کے اختیارات کو وسیع کرتی ہیں۔

(مقصود یہ ہے کہ آنحضرتؐ کس قدر اپنی زندگی اور بیویوں کے مسائل کی طرف توجہ دیتے تھے لیکن پھر بھی ایسی منزلت کو پایا کہ عام انسان اسے پانے سے عاجز ہے (د)

اسلام میں

اصول تعلیم و تربیت

ارشاد پروردگار ہے:

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانا بوا الی اللّٰہ لھم البشریٰ فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ ------" (زمر/۱۷،۱۸)

اور جو لوگ بتوں کے پوجنے سے بچے رہے اور خدا ہی کی طرف رجوع کیا ان کے لئے (جنت کی) خوشخبری ہے (اے رسول) تم میرے (خاص) بندوں کو خوشخبری دے دو جو بات کو جی لگا کر سنتے ہیں اور پھر اس میں سے اچھی بات پر عمل کرتے ہیں۔

گذشتہ مباحث میں (انسان اسلام) کے حوالے سے اجمالاً" بحث کی گئی ہے

اب ہم انسان در اسلام میں جتنی جہات میں بحث کر آئے ہیں انہیں دوبارہ نئے سرے سے دوہراتے ہیں تاکہ دیکھا جاسکے کہ وہ انسان جس کی تربیت کی جا رہی ہے اس کی استعداد سے کس قدر ثمرات و فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں اور انسان کی بابت کیا کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ تاکہ انسان کی اس استعداد میں تکامل پیدا ہوسکے اور اس بحث سے ثمرات مرتب کئے جاسکیں اور اس کے آخر میں ----- اصول تعلیم و تربیت کی ان ثمرات کے مطابق بنا رکھی جائے گی۔

انسان کی آگاہی کی قدرت اور اس کی تربیت کے اصول

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو آگاہی (علم) حاصل کر سکتا ہے اور اسے آگاہ ہونا بھی چاہئے:

ارشاد خداوند تعالیٰ ہے:

(ہمیں اس بحث کے پہلے جلسہ کی کیسٹ نہ مل سکی لہٰذا ہماری اسی کتاب کے انسان اسلام بحث کی طرف رجوع کیا جائے (د)۔

"**والله اخرجكم من بطون امهاتكم لاتعلمون شيئا وجعل لكم السمع والابصار والافئدة لعلكم تشكرون۔** (نحل/۷۸)

وہی تو اللہ ہے جس نے تم سب کو تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا تو اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لئے کان' آنکھ اور دل بنایا' تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو کان' آنکھ اور دل عطا کیے ہیں تاکہ وہ انہیں تصرف میں لائے اور **لا تعلمون شیئا** کی وضع سے باہر نکلے اور عالم بن جائے یہاں پر تعلیم و تربیت کے ایک اصول کا استخراج کیا جاسکتا ہے۔

الف ----- علم دوستی کی ضرورت

سب سے پہلا اصول:

علم دوستی کی ضرورت اور علم کا طلب کرنا ہے۔

اور انہی دونوں چیزوں پر اسلامی تعلیم و تربیت کے اصولوں میں تکیہ کیا جاتا ہے۔

یعنی!

جو انسان ہماری تربیت کے زیر سایہ ہو خواہ وہ ایک فرد ہو خواہ لوگوں کا ایک گروہ ہو خواہ ایک معاشرہ ہو ------ ان کی ایسے خطوط پر تربیت کی جائے کہ جس سے یہ طلبا' علم دوست اور عالم بن جائیں۔ علم کی بابت آیات' روایات' داستانیں' تاریخی شواہد کے ہوتے ہوئے اس بارے میں مزید شواہد کا ذکر کرنا لازم نہیں ہے۔

لہذا ------ ہمیں چاہیے کہ اپنے زیر تربیت شخص کو علم کا شوق دلائیں۔ اور اس کے عالم بننے کے لئے بنیاد فراہم کریں۔ اور ضروری ہے کہ عالم بننے کی بہترین

روش کو کشف کیا جائے۔ اور بروئے کار لایا جائے ۔ وہ علوم جو زیادہ مؤثر ہیں اور وہ مسائل جو زیادہ مفید ہیں ان سے انسان کو آگاہ کیا جائے اور انہیں اس کے اختیار میں قرار دیا جائے۔ یعنی وہ مسائل جو اس کے اندر انتخاب کی قدرت کو پیدا کریں یا اسکی خود سازی کا باعث بنیں یا اسے جامعہ ساز بنائیں ----- اس کے اختیار میں دیئے جانے چاہئیں اور اسے انہی سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ یہ ایک مسئلہ تھا جو علم کے بارے میں اپنی تمام تر تفصیل کے ساتھ مطرح ہوگیا ہے۔ بھولنا نہیں چاہیے کہ ہماری بحث فہرست وار اور وسیع پھیلی ہوئی ہے۔

فکر کرنے کی صحیح روش

دوسرا اصول:

انسان کے اندر فکر کرنے کی صحیح روش کو اجاگر کیا جائے۔

انسان ایسا موجود ہے جو آگاہی سے ہمکنار ہوسکتا ہے۔ اور آگاہی پانے کے لئے ضروری ہے کہ غورو فکر کیا جائے۔

اس مورد میں تمام آیات جن میں

"افلا یتفکرون" "افلا یتدبرون" "افلا یعلمون" "الم تر" "افلم یسیروا" کو استعمال کیا گیا ہے -------- جامعہ سازی کے تمام موارد میں تدبر اور مطالعہ کی اشد ضرورت ہے۔ اور یہ سب فکر کی روش کے صحیح ہونے والی اصل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پس یہ تمام کے تمام ہماری اس (فکر والی) اصل کے شاہد ہیں

جو انسان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پرورش پانا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ وہ

فعالیت کے ساتھ فکر کرے۔ اور فعال فکر کے لئے ترتیب وار چند مسائل ہیں جن کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے:

فکر کے اقسام اور نواحی

بیان ہوچکا ہے کہ فکر کرنا ضروری ہے ------ اور یہ فکر اور سوچ بچار چند نواحی کی محتاج ہے کہ جس میں فکر اور تدبر کیا جائے۔ اس اصول کو محکم یاد کرنے کے لئے قرآن مجید کی تعلیمات اور بیانات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

الف ---- طبیعت شناسی

فکر و اندیشہ کے نواحی میں سے ایک ----- عالم طبیعت ہے جو کہ آسمان' زمین' دریا' حیوانات' چشمہ' مرغزار' کہکشاں وغیرہ وغیرہ ہیں قرآن مجید میں ان چیزوں کی بابت غور و فکر کرنے کے بارے میں بہت زیادہ آیات وارد ہوئی ہیں۔

ب ----- خود شناسی

فکر و اندیشہ کے نواحی میں سے ایک خود انسان ہے۔

ارشاد پروردگار ہے:

"سنریهم ایاتنا فی الافاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق"

(فصلت/۵۳) عنقریب ہم اپنی آیات کو دنیا جہان کے آفاق اور لوگوں کے نفوس میں آشکارا کریں گے یہاں تک کہ ان کے لئے واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے۔

خود شناسی کی بابت حضرت علیؑ نے فرمایا:

"من عرف نفسه فقد عرف ربه" (غرر الحکم)

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا گویا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

البتہ!

یہ ناحیہ طبیعات کے بارے میں مطالعہ کا ایک جز ہے۔ اور طبیعات کے مطالعہ کی بحث میں انسان بھی شامل ہے -----: ان میں فزکس اور بیالوجی' زیست شناسی یا اندرونی نظام کے طریق کار کے جنبہ ہوں۔

یہ کہ دل کس طرح کام کرتا ہے؟ جگر' معدہ اور باقی نظام ہضم کس طرح کام کرتے ہیں اور کس طرح فعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں؟

ہم جس طرح حیوانات' کہکشاں' پتھروں اور دریاؤں کے بارے میں مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندرونی نظام کی بابت مطالعہ کریں گے۔ اور وہ شئے جو یہاں پیش نظر ہے یہ ہے کہ!

انسان میں کون سی معنوی' انسانی اور روحانی حیثیت کی قدر و قیمت ہے؟

اصلاً" انسان اسلام کی منطق کے مطابق کیا ہے؟ اور کس طرح اہمیت اور قدر و قیمت کو پایا جاسکتا ہے اور کن کن بری چیزوں سے اجتناب ضروری ہے۔ انسان اپنی شناخت کیسے کر سکتا ہے؟ اور کس طرح اپنی قدرو قیمت بنا سکتا ہے؟

یعنی!

اندرونی تکامل جس کے ذریعے شاید عرفان اسلامی کے مثبت اصول تک پہنچا جاسکے اور معنوی روحانی پہلوؤں کو حاصل کیا جاسکے خود مستقل اور گسترده بحث کا محتاج ہے۔

ج ----- تاریخ شناسی اور جامعہ شناسی

فکر و اندیشہ کے نواحی میں سے ایک ----- گذشتہ اور موجودہ معاشرہ میں غور

و خوض ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں سفر کی دعوت دی ہے اور انبیا اور گذشتہ قوموں کا تذکرہ کیا ہے ----- جس سے معاشرہ کی بابت غور و خوض کیا جاسکتا ہے۔

بنا برایں ---- تاریخ گذشتہ اور معاشرہ کے بارے میں فکر و اندیشہ بہت جالب مسئلہ ہے۔

د------ وحی کی شناخت اور اسے حاصل کرنا

فکر و اندیشہ کا چوتھا مسئلہ ----- جسے قرآن مجید سے کشف کیا گیا ہے وحی کا مطالعہ اور اس کا حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

"**افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها**" (محمد/۲۴)

کیا (منافق) قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟

آپ قرآن مجید میں بہت زیادہ موارد میں دیکھتے ہیں کہ:

قرآن مجید میں غور و خوض کرنے اور وحی کو حاصل کرنے اور جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں اسے حاصل کرنے کی تشویق دلائی گئی ہے۔

فکر و اندیشہ کی آفت

فکر و اندیشہ کے لئے بہت زیادہ مشکلات ہیں ----- اسلام کی منطق کے مطابق بہت سے مسائل فکر و اندیشہ کے لئے آفت اور مصیبت ہیں۔ جو انسان کو گمراہ کرتے ہیں اور نتیجتاً اس کے لئے مطالعہ اور فکر و تحقیق خرافات اور افسانہ بن جاتے

ہیں اور وہ باطل اور منحرف بن جاتا ہے۔ چند چیزوں کو اسلام نے فکر و اندیشہ کے لئے آفت قرار دیا ہے۔

الف ---- اندھی تقلید

اس کی بابت بہت زیادہ آیات ہیں ----- جب کفار کو قرآن کے مطالعہ کی دعوت دی جاتی تھی یا کہا جاتا تھا کہ جو پیغمبر اکرمؐ تمہارے لئے لائے ہیں قبول کرو تو وہ کہتے تھے کہ:

"ہم نے اپنے آبا و اجداد کو جس راستہ پر دیکھا ہے وہی صحیح ہے اور ہمارے لئے وہی کافی ہے۔

قرآن مجید میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے۔

"-----**اولو کان آباء هم لا یعلمون شیئا ولا یهتدون**" (مائدہ/۱۰۴)

اگرچہ ان کے آبا و اجداد کچھ نہیں جانتے تھے اور ہدایت پر نہ تھے (لیکن پھر بھی اپنے لئے ان کی پیروی کو لازمی سمجھتے تھے)

اب بھی ہم افراد اور قوموں کو دیکھتے ہیں کہ وہ بڑوں کی غلط و صحیح فکر کی پیروی کرتے ہیں خصوصاً" جو منفی اور اندھی سوچ میں گرفتار تھے۔

یہ (بڑوں کی غلط تقلید) فکر اور اندیشہ کی آفات میں سے ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ:

اپنی فکر کو آزاد رکھو تاکہ وہ صحیح نتیجہ دے سکے۔ اور جو چیز ایک قوم میں سالہا سال سے سنت چلی آرہی تھی وہ اس میں فکر کر چکے تھے ----- انسان کو ان کی سوچ اور نظریہ سے متاثر نہیں ہونا چاہئے بلکہ آزادی کے ساتھ غور فکر کرکے نظریہ قائم

کریں۔

اس بارے میں بھی بہت زیادہ آیات ہیں حتیٰ کہ خود ماں باپ کی بابت قرآن مجید میں ارشاد پروردگار ہوتا ہے۔

وان جاهداک علی ان تشرک بی مالیس لک به علم فلاتطعهما وصاحبهما فی الدنیا معروفا ------" (لقمان/۱۵)

اگر تمہارے ماں باپ تمہیں شرک پر مجبور کریں کہ جسے تم حق نہیں سمجھتے تو اس صورت میں ان کے حکم کی اطاعت نہ کرو البتہ دنیوی امور میں ان کے ساتھ حسن خلق سے رہو۔

ب ---- طاغوت کی پیروی

طاغوت یعنی :

ہر طغیان اور سرکشی کا مرکز جو چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بازی گری کرے اور سارے معاشرہ کی فکر اور حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ طاغوت کی تلقینات اور ان کے اہداف اور راستہ فکر و اندیشہ کے لئے آفت ہیں۔ یعنی جو فکر طاغوت کے زیر اثر ہوگی وہ کبھی کار آمد نہیں ہوگی۔ یہ مسئلہ :

یعنی طاغوت کے حکم کا تسلیم کرنا ---- آیت الکرسی میں بیان کیا گیا ہے

"-------- **والذین کفرو اولیاء هم الطاغوت یخرجونهم من النور الی الظلمات** ----" (بقرہ/۲۵۷)

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے دوست طاغوت ہیں جو انہیں نور سے نکال کر (گمراہیوں کی) تاریکیوں میں ڈالتے ہیں۔

یا یہ آیت جو اسلام کی روشن بینی کو بیان کرتی ہے۔!

"والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدو ھاو انابوا الیٰ اللہ لھم البشریٰ فبشر عبادالذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ -----" (زمر/۱۷،۱۸)

جنھوں نے طاغوت کی عبادت سے دوری کو اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کی انہیں رحمت خدا کی بشارت ہو۔ اے حبیب میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دو جو بات کو سنتے ہیں اور جو اچھی ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔

سب سے پہلے طاغوت سے اجتناب ضروری ہے ورنہ آزادی باقی نہ رہے گی اور انسان بہترین قول پر کاربند بھی نہ ہو پائے گا۔

ج ---- بزرگوں کی اندھی تقلید

یہ بھی اندیشہ کے لئے آفت ہے ----- جب بروز قیامت ان؛ سے پوچھا جائے گا --- کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو جواب میں کہیں گے۔

ربنا انا اطعنا سادتنا و کبرائنا فاضلونا السبیلا" (احزاب/٦٧)

اے ہمارے پرودگار! ہم نے اپنے بزرگوں کی اطاعت، کی انہوں نے ہمیں گمراہی کے راستے کی طرف کھینچا۔

بطور کلی ----- انسان بعض چیزوں کا خلاصہ ہے۔ ایک گروہ علمی اعتبار سے آگے ہے۔ اور بعض انتظامیہ یا اقتصاد کے حوالے سے آگے ہیں بعض ملت کے سردار اور بعض ارباب اقتدار کے طور پر دنیا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سب کے مقابلے میں آنکھیں خوش و خرم ہیں۔

بعض لوگوں میں مغرب والے لوگوں کی اصطلاح کو مقام حاصل ہے۔ ان حالات

میں انسان کی فکر درست کام نہیں کر سکتی جب اس کے سامنے چار مغربی فلاسفروں کے نظریات رکھ دیے جائیں ----- یا جب کسی معروف فلاسفی کی کتاب یا نشریہ صادر ہو تو لاکھوں نسخے چھاپ دیئے جاتے ہیں اور دنیا کی خبروں میں اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں نظریہ پیش کیا ہے۔ اس قدر پرچار کیا جاتا ہے کہ کسی محقق کی فکر آزاد نہیں رہ سکتی۔ بلکہ اس کے نظریے کے مقابلے میں احتمال بھی نہیں دے سکتا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ اس کی فکر ہی غلط ہو۔

بنا برایں ----- فکر اور اندیشہ کے اصول کی آفت میں سے ایک یہ ہے کہ:
انسان کس طرح پرورش اور تربیت پائے کہ جو مختلف جہات میں بڑا اور سردار بنے اور اپنی فکر کو آزاد کرے تاکہ خوب مطالعہ کرے جس سے اس کی آنکھ اور کان بند نہ ہوں۔

د ---- ہوائے نفس کی پیروی

ہوائے نفس کی پیروی ---- فکر و اندیشہ کے لئے آفت ہے۔ اور یہ انسان کی گمراہی کا موجب ہے۔ اس بارے میں بھی متعدد آیات ہیں۔

"بل اتبع الذین ظلموا اھوائھم بغیر علم فمن یھدی من اضل اللہ و مالھم من ناصرین۔" (روم/۲۹)

یہ ظالم لوگ اپنی خواہشات نفس کی جہالت اور نادانی کی وجہ سے پیروی کرتے تھے (اتمام حجت کے بعد) جسے اس نے گمراہ کر دیا اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے۔

اگر انسان ہوائے نفس کا اسیر بن جائے تو وہ سرگردان اور بے یارو مددگار ہو

جائے گا۔ انسان ایسی حالت پیدا کرے گا کہ ----- اس کی صنعت کی پیشرفت' بے چارگی اور گم گشت ہو کر رہ جائے گی۔ اپنے ہدف اور راہ کو بھلا دے گا اور بلا ناصر و مددگار ہوجائے گا۔ اس کی رہبری کے لئے کوئی چراغ روشن نہ ہوگا۔

ایک اور مقام پر ارشاد پروردگار ہوتا ہے۔

"----- **ولا تتبع الھوٰی فیضلک عن سبیل اللّٰہ** ---" (ص/۲۶)

اپنی خواہشات کی اتباع نہ کرو ورنہ اللہ کے راستہ سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے!

افرایت من اتخذ الھہ ھواہ واضلہ اللّٰہ علی علم" (جاثیہ/۲۳)

(اے رسول) کیا تم دیکھتے ہو ایسے شخص کو جو خواہشات کو اپنا خدا سمجھتا ہے اور خدا نے دانستہ طور پر اسے گمراہ قرار دیا ہے۔

ہوا پرستی علم' آزاد اندیشہ' حق یابی' حق طلبی کی مخالف ہے۔ لہٰذا اگر دیکھا جائے تو ----- بڑی بڑی علمی شخصیات اعتقادات فاسد و غلط پر ہوتی ہیں اور منکر خدا ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہوائے نفس کے تسلط میں بری طرح سے جکڑے ہوئے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"**اکثر مصارع العقول تحت بروق المطامع**" (بحار جلد ۷۳ ص ۱۷۰)

طمع اور لالچ عقل کو زمین پہ دے مارتی ہے اور اسے کام سے بیکار کر دیتی ہے۔ جس سے فکر اپنا کام چھوڑ دیتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہوس پر کنٹرول کیا جائے۔

ھ ----- گمان کی پیروی

ظن کی پیروی ----- بھی فکر کے لئے آفت ہے قرآن مجید میں اس پر بہت

زیادہ تکیہ کیا گیا ہے۔ آپ قرآن میں دیکھتے ہیں کہ اتباع ظن کا مسئلہ جدی طور پر محکوم ہوا ہے۔

یعنی!

ایک فرد یا ملت اگر اسلامی تربیت کے معیار کی اساس پر رشد پائے تو ہرگز بغیر مطالعہ کے قضاوت نہیں کرے گا۔ اور وہ قضاوت جو حدس، تخیل، گمان، خواب و خیال کے ہو ---- اس سے دور رہے گا۔ گمان کو قرآن کی اصطلاح کے مطابق **امانی** کے لفظ سے وارد کیا گیا ہے۔

"------- **لایعلمون الکتاب الا امانی** ---" (بقرہ/۷۸)

وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے گمان کے۔

خواب و خیال ---- ہوس و آرزو کا تعلق انہی گمانوں کے ساتھ ہے۔ ایسا شخص دینی اعتقاد تو رکھتا ہے لیکن اس کا یہ اعتقاد امیدوں، گمانوں اور خواب و خیال کی بنا پر ہوتا ہے اسے اس میں یقین نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اسے اعتقاد کے عنوان سے قبول کرتا ہے۔

بنا برایں ---- اگر کوئی چاہے کہ اس کی فکر صحیح کام کرے اور فائدہ مند ہو تو اسے غیر محققانہ اور غیر منصفانہ روش سے اجتناب کرنا چاہئے۔ لہٰذا انسان کی فکر اس طرح سے تربیت یافتہ ہونی چاہئے کہ اس کی فکر کی بنیاد حدس اور گمان پر نہ ہو۔

اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد باری تعالٰی ہوتا ہے:

"**قل یا اہل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق** ---" (مائدہ/۷۷)

کہو اے اہل کتاب اللہ تعالٰی کے دین میں ناحق غلو نہ کرو۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

"ومایتبع اکثرهم الاظنا" ان الظن لایغنی من الحق شیئا ان اللّٰہ علیم بما یفعلون" (یونس/۳۶)

وہ اکثر اتباع نہیں کرتے مگر ظن کا اتباع کرتے ہیں تحقیق ظن حق سے بے نیاز نہیں کرتا تحقیق اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔

اکثر وہ لوگ جو منحرف راہ پر گامزن ہیں ان کے عقائد' دین' مسالک' مذاہب ---طرز فکر غلط ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر گمانوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ------ افراد کے بارے میں ان کی بہت زیادہ قضاوت' مقامات' سیاسی اور اجتماعی مسائل کی بنیاد ظن اور گمان پر ہوتی ہے۔ انسان کسی شئے کی بابت خبر سنتا ہے اور اپنے ذہن کی گہرائیوں میں اس سنے ہوئے خیال کو احتمال کے طور پر جما لیتا ہے اور اس کی بابت اسی بنیاد پر قضاوت کرتا ہے۔ اسلام اس نکتہ پر کس قدر تکیہ رکھتا ہے تاکہ وہ سائل میں علم و روشن بینی کو پیدا کرے۔ حدس اور گمان انسان کو کسی نتیجہ تک نہیں پہنچاتا۔

سوال : کیا اس فکر کی آفت کے نتیجہ میں گناہ بھی مترتب ہوتا ہے؟

جواب : گناہ ایک شرعی اصطلاح ہے۔ انسان کے لئے ایک شئے بعنوان وظیفہ مسلم ہے۔ اور اس سے تخلف کر جائے تو یہ گناہ کا باعث ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح بحث کریں کہ اصلاً" تعبد شرعی کے ناحیہ میں قرار نہ دے۔ میں فکر کرتا ہوں کہ ہوس اور طمع گناہ ہے ----- کیونکہ گناہ ہوس پرستی اور طمع ہے۔

گناہ یعنی تخلف۔ یہ تخلف کس شئے سے پیدا ہوتا ہے؟

اس تخلف کو آپ یوں عنوان کر سکتے ہیں ---- متربی شخص حق کو تسلیم کرے اور اگر حق واضح ہو جا۔ تو یہ وظیفہ کے عنوان سے مطرح ہوگا۔ اس صورت میں اگر وہ تخلف کرے گا تو گناہگار ہوگا۔ یعنی یہ ایک مستقل اور تازہ عنوان کی مثل ہے۔ لیکن اس وقت تک جب تلک ان وظائف کی معرفت حاصل نہ ہوئی ہو اور

بصیرت

مسئلہ بصیرت یہاں بیان کرنا مناسب ہے۔ وہ کانفرنس جو ٹوکیو میں اخلاقی مسائل کی بابت مطرح ہوئی تھی اس میں میں نے ملاحظہ کیا تھا کہ مسئلہ بصیرت پر بعنوان اصل تربیتی تاکید اور تحقیق کی گئی۔ ؎

ارشاد ہوتا ہے:

"قد جاء کم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا"

(انعام/۱۰۴)

تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت آگئی ہے اب جو بصیرت حاصل کرے گا وہ خود سعادت مند ہوگا اور جو بصیرت حاصل نہیں کرے گا اپنا نقصان

ان کا معیار ابھی ہاتھ نہ آیا ہو ------ ہم کہتے ہیں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری فکر آزادانہ کام کرے تو ضروری ہے کہ اپنی فکر میں ہوس لذات اور طمع کو داخل نہ ہونے دو۔

شہوت و سرمایہ اور طمع انسان کی فکر کو آزاد اور آگے نہیں بڑھا سکتے۔ تاکہ اس سے ثمرات حاصل کئے جائیں۔ ایک حد تک تمام دنیا والے اس مسئلہ کو درک کر سکتے ہیں۔

اگر ہم چاہیں کہ ابھی گناہ کی بحث میں وارد ہوں تو درست نہیں ہے کیونکہ یہ اس بات پر منحصر ہے ------ کہ سب سے پہلے وظیفہ کو پہچانا جائے اور بعد میں حق کو پہچانا جائے لہٰذا گناہ کے مسئلہ کو وظیفہ اور حق شناسی میں بیان کیا جائے گا۔ اس کے بیان کا مورد وہاں ہے۔

۱۔ (انسان اسلام میں ارادہ اور آزادی انتخاب کی بحث کی طرف رجوع کیا جائے (د)

بصیرت سے مراد روشن بینی ہے جس کے ذریعے انسان مسائل میں واضح اور صریح طور پر قضاوت کرسکے۔

بہتر ہے کہ اسے بیان کیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن مجید اس مسئلہ پر کس طرح بحث کرتا ہے۔

کرے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد پروردگار ہے:

قل هذه سبيلى ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعنى" (یوسف/۱۰۸)

کہہ دو یہ میری راہ ہے جس کے لئے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور میری اتباع کرنے والے بابصیرت ہیں۔

یعنی:

میں بابصیرت ہوں اور اسی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ یا یہ کہ تمہارے لئے بصائر اور روشن بینی آچکی ہے تاکہ تم درست فکر کو بروئے کار لاؤ اور جلد از جلد اس کے ثمرات سے بہرہ مند ہوسکو۔

کبھی کبھی انسان مبہم، تاریک اور نشیب و فراز والے مسئلوں پر قضاوت کرتا ہے۔ اس صورت میں طولانی بحثیں کرنے کے باوجود نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور کبھی کبھی انسان روشن اور صریح طور پر قضاوت کرتا ہے جو بصیرت اور روشن بنی کا نتیجہ ہے۔

البتہ!

کبھی جلدی قضاوت کا سبب مطالعہ کا نہ ہونا ہے۔ یوں کہ انسان نے کسی بات کو سنا اور یقین کرلیا۔ یہ بصیرت اور روشن بینی نہیں ہے۔

اتنی طولانی بحث کے بعد اب ----- متعدد تربیتی اصولوں کی بحث کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کے لئے ---- استخراج کرسکتے ہیں:

انسان کی فکر کا رشد کیوں ضروری ہے؟ اس لئے تاکہ حق اور صحیح راہ کو حاصل کرلیا جائے اور اپنی ان اساس پر خود سازی کی جائے۔

یعنی!

انسان ان ضوابط کے تحت خود سازی کرے۔

امر بالمعروف اور **نھی عن المنکر** کے بنیادی شرائط میں سے ایک علم و آگاہی ہے۔ یعنی انسان کو پہلے علم ہو اور پھر دوسروں کی طرف متوجہ ہو کر انہیں حکم دے یا منع کرے۔

بنا بر ایں ----- انسان اپنی تمام تر کوششوں کو انجام دے تاکہ ایک فرد کو صحیح طور پر تیار کیا جائے۔

اور ضروری ہے کہ وہ انسان ضابطہ' معیار اور ملاک رکھتا ہو۔ اور ابتداہی سے فکر و اندیشہ اور آگاہی کو بروے کار لایا جائے۔

انسان کے انتخاب کی قدرت اور اس کی تربیت کے اصول

ہم جان چکے ہیں کہ انسان ایک موجود ہے جس میں قدرت اختیار اور انتخاب ہے۔ یہ اپنا مصمم ارادہ بنا سکتا ہے۔

اس مسئلہ میں متعدد آیات ہیں۔

البتہ!

انسان کے انتخاب کا طریقہ کار محدود ہے۔ ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ انسان سو فیصد آزادانہ طور پر ارادہ کرتا ہے اور اسے عملی جامہ پہناتا ہے۔ مختلف دوسرے عوامل بھی ہیں جو محدودیت کو ایجاد کرتے ہیں۔ لیکن انسان میں اجمالا" انتخاب کی قدرت ہے۔

(انسان اسلام میں ارادہ اور آزادی انتخاب کی بحث کی طرف رجوع کیا جائے (د)

ایک قابل ذکر مطلب ہے اور وہ یہ کہ :

مکتب اسلام اور فلسفہ مادیت کا آزادی اور انتخاب کی قدرت میں فرق ہے۔

ان کا فلسفہ کہتا ہے ! آزادی انسان یعنی انسان اخلاق کا بنانے والا ہے اور آزاد ہے۔ انسان خود ارادہ کرتا ہے۔ اور اس خاص چیز کا انتخاب کرتا ہے۔ اور آگے بڑھتا ہے۔ اس کی آزادی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اصلا" تمام چیزیں اس کی مخلوق ہیں۔ یہاں تک کہ خیر اس کی مخلوق ہے۔ وہ جسے تشخیص دیتا ہے اسے پسند کرتا ہے لہذا اسکا ارادہ کرتا ہے اور اچھا بننا چاہتا ہے۔

اسلام میں بھی قدرت انتخاب ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں اندھا انتخاب ہے اور اسلام میں راہنمائی والا انتخاب ہے۔ اور یہ تفاوت بہت جالب ہے۔

قرآن مجید میں وارد ہوا ہے کہ :

واما ثمود فهدينا هم فاستحبوا العمى على الهدىٰ" (فصلت/۱۷)

ہم نے قوم ثمود کو ہدایت کی لیکن انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر پسند کیا۔

"**انا هديناه السبيل اما شاكرا واما كفورا**" (دہر/۳)

ہم نے (حق اور باطل کے) راستہ کی ہدایت کر دی ہے خواہ شکر گزار بن جائے خواہ ناشکرا بن جائے۔

یعنی!

اس کا محیط روشنی کا محیط ہے۔ روشنی اور کھلے راہ کو انسان کے اختیار میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ عین حال ----- انتخاب کی قدرت سے انسان کو نوازا گیا ہے۔ اسے لمبے دریا اور تاریک بیابان میں تنہا نہیں چھوڑا گیا اور نہ ہی وہ شتر بے مہار ہے۔

اسلام میں انسان خود کام کرتا ہے اور خود ہی قدم اٹھاتا ہے۔ حالانکہ اس کے

سامنے مختلف راستے ہوتے ہیں مثلاً" شاہراہ' سنگلاخ' راہ سعادت وغیرہ ——

اس فلسفہ والے کہتے ہیں کہ انسان کی رہبری کے لئے کوئی نور موجود نہیں ہے۔ کوئی اشارہ اس کی راہنمائی کے لئے موجود نہیں ہے کہ انسان اسے دیکھ کر اس پر اعتماد کرے۔

اسلام کہتا ہے کہ راستہ پر اشارہ موجود ہے انسان کی مرضی ہے چلتا جائے یا رک جائے۔ یعنی اسے انتخاب میں اختیار حاصل ہے۔ البتہ انسان کو ہدایت کا ساتھ دینے پر مجبور قرار نہیں دیا گیا۔

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" (بقرہ/۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں ہے تحقیق رشد نافرمانی کی نسبت واضح ہو چکا ہے۔

یہ مسئلہ بہت زیادہ اہم ہے —— راہ ہدایت راہ گمراہی کی نسبت آشکارا ہے۔ کسی قسم کا جبر اور سینہ زوری درکار نہیں ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے اور طاغوت سے اجتناب کرے" **فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا**" (بقرہ/۲۵۶) گویا کہ وہ محکم رسی میں متمسک ہیں جو ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔ اور جو سرکشی کی راہ پر گامزن ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ لے وہ تاریکی اور اندھیروں میں غرق ہو جاتا ہے۔

بنا براین —— وہ آزادی جو رہبری کے زیر سایہ حاصل ہوتی ہے اس کا محیط روشن اور کھلا ہوا ہوتا ہے۔ ہم نے پہلی فصل میں کہا تھا:

فکر و اندیشہ میں وحی کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے پروگرام کو کشف کرنے کے لئے سعادت کے راستہ کو درک کیا جا سکے۔ علم جو کہ فکر کا خلاصہ اور وحی کا نتیجہ ہے' انتخاب اور آزادی کی قدرت کو پیدا کرتا ہے۔

اب ہم یہاں چند ایک تربیتی اصول کو واضح کرتے ہیں۔

الف ——— تقویت ارادہ

سب سے پہلے ارادہ کو تقویت دینا چاہئے ——— اس کے بعد انسان انتخاب کی قدرت رکھتا ہے۔ اور جو دل پتھر اور تاریک ہو تو کوئی رحمت اور برکت اس میں نمودار نہیں ہوگی۔ آزاد اور سنگدل شخص کے دل میں مہربانی آ ہی نہیں سکتی اور وہ پختہ ارادہ بھی نہیں کر سکتا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"——— وان من الحجارۃ لما یتفجر منه الانھار وان منھا لما یشقق فیخرج منه الماء ———" (بقرہ/۷۴)

بعض ایسے پتھر ہیں کہ جن سے نہریں پھوٹتی ہیں اور بعض پتھروں کو توڑا جائے تو ان سے پانی نکلتا ہے۔

بنا بر این ——— ضروری ہے کہ آزادی کی قدرت کی علم و آگہی کی قدرت کی طرح حفاظت کی جائے۔ اور بعد میں اسے رشد دیا جائے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ:

اللہ تعالٰی نے انسان کو خلق فرمایا ہے اور اسے آگاہ بنایا ہے۔ البتہ! ایسے لوگ بھی ہیں جن کی عمر کے ساٹھ سال گزر چکے لیکن ابھی بھی بے خبری اور جہالت کے اندھیروں میں غرق ہیں۔ اللہ تعالٰی نے انسان کو آزاد خلق فرمایا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ یہی آزاد انسان بے چارہ ہو جائے۔ اور ممکن ہے کہ زیر قہر و حکم قرار دیا گیا ہو۔ پس ضروری ہے کہ انسان اپنے ارادہ کو نجات دلائے اور اسے تقویت دے۔

ارادہ کی تقویت کے لئے اسلام کے عملی پروگراموں کا ایک سلسلہ ہے۔

یعنی:

اس کے آثار میں سے ارادہ کی تقویت ہے۔ جب ہم فلسفہ کو باقی نہیں رکھنا چاہتے تو کہتے ہیں کہ : اسلام کے عملی پروگراموں کا صرف اور صرف ہدف ارادہ کی تقویت ہے۔

مثال!

روزہ کے آثار میں ارادہ کی تقویت ہے۔

نماز صبح بلکہ باقی تمام نمازیں بھی انسان کے ارادہ کی تقویت کرتی ہیں متعہد مسلمان جو واجبات الہٰی کا پابند ہو ----- وہ صبح سویرے سویرے بیدار ہوتا ہے اور نماز ادا کرتا ہے۔ یا سرمایہ خرچ کرکے اپنی خود سازی کرتا ہے۔ اس کا یہ معنی ہوا کہ انسان ہمیشہ اپنے ارادہ کو قوی کرتا ہے اور اپنے کو مہار ڈالتا ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو واجبات کی بجا آوری سے آزاد نہیں سمجھتا۔ ہاں اگر طمع، ہوس، راحت طلبی، سستی، عیش و عشرت طلبی سے اثر قبول کرے تو تمام وظائف اور واجبات کی ادائیگی ادھوری رہ جاتی ہے وہ عیش و عشرت کی قید میں اسیر بن جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ارادہ ہاتھ سے نہ جانے دے اور ارادہ کے ثمرات سے بہرہ مند ہو ----- لہٰذا ضروری ہے کہ مفاسد اور سستی و ناتوانی سے اجتناب کیا جائے۔ اور ان کے ساتھ مبارزہ کرنا چاہئے ----- اور یہ خود ایک تربیتی اصول کو مطرح کرتا ہے۔

ب --- ارادہ کے تباہ کرنے والی آفات سے مبارزہ

تعلیم کا دوسرا اصول ----- ارادہ کے تباہ کرنے والی آفات سے مبارزہ کرنا ہے:

ا--- ہوائے نفس کے خلاف مبارزہ

اس موضوع کی بابت ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"واما من خاف مقام ربه و نهی النفس عن الهوٰی فان الجنة هی الماوٰی" (نازعات/۴۰'۴۱)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے ڈرتا ہو اور اپنے نفس کو خواہشات سے بچائے تو ایسے شخص کا ٹھکانا جنت ہے۔

البتہ!

یہاں نفس کے بارے میں بحث کرکے ایک نئی فلسفی بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ اور اس کی اقسام مثل نفس لوامہ' نفس امارہ ---- پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔

لیکن خلاصہ کے طور پر اتنا عرض ہے کہ یہاں نفس سے وہ نفس مراد ہے جو انسان کو جنبہ خاکی کی طرف کھینچے۔ یعنی اسے مادیت شہوت کی طرف لے جائے۔ وہ نفس جو اس آیت میں بیان ہوا ہے:

"---- **ان النفس لا مارة بالسوء الامار حم ربی** ----" (یوسف/۵۳)

نفس انسان کو برائی کی طرف کھینچتا ہے سوائے اس کے جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

نفس کو آلودگی سے بچانا' رشتہ داروں سے حسن سلوک' تقویت ارادہ' مقاومت اور اس قسم کے کئی اور مسائل ہیں جنہیں انسان اپنے ارادہ کے ساتھ زندہ رکھتا ہے۔ اور انہیں سرانجام دیتا ہے۔

رشتہ داروں سے حسن سلوک ایک تربیتی اصل ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ:

انسان ایسے شخص کو جو رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتا ہو ---- اہمیت دے۔

ناتوانی اور بناوٹ سے اجتناب کیا جائے

یہاں پھر سے طاغوت اور سرکشی کرنے والوں کا مسئلہ مطرح ہوگا۔ ممکن ہے کہ انسان اپنے آپ کو ان چیزوں کے مقابلے میں جن کی بابت اس کی آنکھ' کان خوش ہیں یا جن امور کو اپنے تسلط سے انجام دے سکتا ہو ----- ناتواں اور محکوم محسوس کرتا ہے۔

یہ ناتوانی انسان سے اس کے ارادہ اور آزادی کی قوت کو سلب کرتی ہے۔ اور اس کے ارادہ کی آزادی کو لے کر اسے ناتواں چھوڑ دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ملت کے ایک سو ملین افراد ہوں ----- اور ان میں (صحیح) فرد کوئی بھی نہ ہو:

"فلو لا کان من القرون من قبلکم اولو بقیة ینھون عن الفساد فی الارض الا قلیلا" ممن انجینا منھم ----" (ہود/۱۱۶)

پھر جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان میں کچھ لوگ ایسے عقل والے کیوں نہ ہوئے جو (لوگوں کو) روئے زمین پر فساد سے روکا کرتے (ایسے لوگ تھے تو) بہت تھوڑے سے اور یہ انہی لوگوں میں سے تھے جنہیں ہم نے (عذاب سے) بچالیا۔

قرآن مجید میں **اولو ابقیة** کی تعبیر نے مجھے اپنی طرف جذب کیا! کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ان لوگوں میں کوئی غیرت مند' ارادہ و قدرت اور روحانیت رکھنے والا کوئی شخص نہ تھا جو لوگوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے منع کرتا؟

پس نوبت یہاں آپہنچی کہ لوگ غلامی اور ناتوانی کا شکار تھے۔ بنا برایں ----

یہاں ہی مسئلہ طاغوت' مسئلہ طمع و ہوس ----- پیدا ہوتے ہیں۔

۳----- راحت طلبی اور سستی کے ساتھ مبارزہ

ارادہ کی آفات میں سے ایک ----- راحت طلبی اور سستی ہے۔ ایک وقت انسان طمع میں گرفتار ہوتا ہے اور زندگی عیش و عشرت کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ اس کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ سرمایہ حاصل کرنے کے لئے اور شہوت کے وسائل کو حاصل کرنے کے لئے کام کیا جائے ----- اس چیز سے آہستہ آہستہ ارادہ سلب ہو جاتا ہے۔

یعنی:

جو جوان شہوت میں گرفتار ہو اور اس کی سوسائٹی اچھی نہ ہو تو وہ آہستہ آہستہ ارادہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اپنی حیثیت کو بھلا بیٹھتا ہے۔ ایسا ناتواں اور بے چارہ بن جاتا ہے کہ درس' مدرسہ' یونیورسٹی کی کتب کے مطالعہ کو بھی کھو بیٹھتا ہے اور خود بخود عیش و عشرت کی راہ پر کھنچا چلا جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص میں ہوا و ہوس اور لذات کی خواہش نہیں ہوتی بلکہ سست ہوتا ہے وہ عیش و عشرت کو نہیں چاہتا ----- صرف اور صرف سستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ بھی ارادہ کے لئے آفت ہے۔

یہ راحت طلبی اور ناتوانی انسان کو قدرت کے مقابلے میں چھوٹا بنا دیتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ شخص ارادہ پر قدرت نہیں رکھتا۔ یہ ایک آفت ہے ----- لہٰذا سستی اور ناتوانی سے مبارزہ کیا جائے۔

حق کا قبول کرنا ہی تربیت کا ماحصل ہے

ارادہ سے دوری اور آفات سے اجتناب کا خلاصہ کیا ہے؟ ----- اگر ہماری

تربیت ایسی ہوتی کہ ارادہ کی تقویت کی مشق کرائی جاتی تو اس سے ہم خود خواہی اور ہوا و ہوس سے دور ہو جاتے۔ طاغوت کے پنجے اور سستی کے ساتھ مبارزہ آرائی کی جائے۔ ایسا کرنے سے انسان کی فکر و اندیشہ بھی زیادہ کام کرے گی اور انسان میں یہ حالت پیدا ہوگی کہ ---- وہ اندیشہ سے قوی کام اور مصمم ارادہ رکھے گا اور آفت کی زنجیروں سے آزادی حاصل کرے گا۔ اور یہ اس کی مردانگی کی دلیل ہے۔ ارشاد پروردگار ہے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام" (آل عمران/۱۹)

اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام ہے۔

" ---- **فان تولوا فقولوا اشھدو بانا مسلمون** " (آل عمران/۶۴)

اگر وہ پھر جائیں تو کہو گواہ ہوجاؤ کہ ہم مسلمان ہیں۔

"**ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ** ----" (آل عمران/۸۵)

قیامت کے دن جو اسلام کے علاوہ دین کا دعویدار ہوگا اس سے اس کی بات کو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اسلام اور مسلمین کے بارے میں بحث کرنے کا یہی مقام ہے۔

جہاں کفر' اندھاپن' اتباع ظن' ہوا و ہوس کی پیروی' ناتوانی' غلامی' طاغوت کی عبادت یہ سب حق کے مقابلے میں تسلیم ہونے سے مانع ہیں۔ ایک نکتہ کہ جسے یہاں بیان کرنے پر میں مائل ہوں یہ ہے کہ:

بعض کہتے ہیں کہ اسلام ناتوانی اور تعبد محض ہے۔

یعنی: انسان کو کہا جائے ---- اپنی آنکھ اور کان کو بند کردو اور تمہیں جو کہا جا

رہا ہے اسے قبول کر لو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ ایسا کرنے سے انسان ناتوان اور پست بن جاتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ کہا جائے ----- بنا بر تمام مقدمات کے جو ذکر ہو گئے ہیں ---- اسلام شدت کے ساتھ ظن کی اتباع اور اندھی پیروی کی مذمت کرتا ہے اور انسان کو مطالعہ اور فکر کی دعوت دیتا ہے۔ واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

"----- **فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه**" (زمر/۱۷، ۱۸)

میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔

کس شخص کے لئے خوشخبری ہے اور کون شخص سعادت مند ہے؟ جو مختلف باتوں کو سنتا ہے اور ان میں سے اچھی کا انتخاب کر کے عمل کرتا ہے۔ یہ لوگ ہدایت یافتہ اور اہل بہشت ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ اپنے علم، تحقیق، تفکر، مطالعہ اور تمام ان آفات سے جو انسان کی فکر کو گمراہ اور متزلزل کرتی ہیں اور اسے سست بناتی ہیں، تسلط، آزاد ارادہ قوی اور حق کے لئے مردانگی کریں اور انہیں تسلیم کریں۔

کیا حق کے تسلیم کرنے کو مردانگی کہتے ہیں یا حق سے روگرانی کرنا مردانگی ہے؟

آیا ایسے حق کو تسلیم کرنا جو پہچانا ہوا ہے اور وہ حق جس تک ہم پہنچ چکے ہیں ---- ناتوانی ہے؟

اگرچہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ یہ حق اس کے پہلے عقیدہ کے خلاف ہے جس کے بارے میں تعصب رکھتا تھا؟

یعنی! پہلے ایک مسئلہ کو بیان کیا کرتا تھا اور اس کے گرد و پیش عمل پر مصر تھا۔

اب کوئی شخص کسی اور بہترین بات کو کیسے ثابت کرے جس سے حق اس کے لئے روشن ہو جائے۔ اس کی مردانگی، شہوت اور کسی حد تک اس میں غیرت ہے کہ وہ پہلے عقیدہ کو چھوڑ کر نئے عقیدہ کو بیان کرنے لگا ہے۔

ایک حق کو پہچانتا ہے کہ یہ منافع، مطامع اور ہوا و ہوس کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ کس طرح طمع و لالچ کو چھوڑ کر حق کو قبول کرے گا؟

ارشاد پروردگار ہے:

والذین اجتنبو الطاغوت ان یعبدوها وانا بوا الی اللّٰہ لهم البشریٰ"

(زمر/۱۷)

جو طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں ان کے لئے خوشخبری ہے۔

کیا یہ انسان کے اپنے بس کی بات ہے یا وہ میت کی مانند ہے جو غسل دینے والوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے کہ وہ اسے جیسے صحیح یا غلط چاہتے ہیں اپنی قدرت سے نہلواتے ہیں؟ کیا اسلام نے آکر لوگوں کی گردنوں سے غلامی کی زنجیروں کو اتار پھینکا ہے کہ جس جس سواری پر سوار ہو جلدی سے اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا۔ یا اس لئے آیا ہے کہ اس پر صحیح طریقے سے بار لادا جاسکے؟!

"------ **ویضع عنهم اصرهم والا غلال التی کانت علیهم**" (اعراف/۱۵۷)

رنج و مشقت والے احکام کہ جن کی زنجیر اپنی گردن پہ رکھے ہوئے تھے ------ اٹھالئے ہیں۔

بنا برایں ------ ہم کہتے ہیں کہ:

اس کے بعد ہم فکر اور آزاد اور قوی فکر کی تلاش کرتے ہیں۔ قرآن مجید بھی ایسے ہی اسلام کی دعوت دیتا ہے۔

"ان الدین عند اللہ الاسلام" (آل عمران/۱۹)

اور اصلاً" غیراز اسلام کوئی دوسرا دین قابل قبول نہیں ہے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ۔" (آل عمران/۸۵)

کلمہ حق گمان، ہوائے نفس، طاغوت کے مقابلے میں کیسے پڑھنا چاہئے۔

ان سب کے مقابلہ میں کلمہ عدل کو کیسے پڑھنا چاہئے:

"یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوٰی فیضلک عن سبیل اللہ-----" (ص/۲۶)

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ پس مخلوق خدا کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں راہ خدا سے گمراہ قرار دے دے گی۔

بنا برایں ----- ضروری ہے کہ حق کے مقابلے میں سر تسلیم خم کیا جائے اگر ہم اپنی تربیت کے زیر سایہ لوگوں کو (خواہ فرد ہو یا جامعہ ہو) حقیقت پذیری تک پہنچائیں تو بہت زیادہ مہم اساسی کام ہوگا۔ تاکہ تعصب اور بیہودہ مسائل سے نجات پائی جاسکے اور آزاد ہو سکیں۔

جو لوگ حق تک پہنچ گئے ہیں جب ان کے سامنے کسی مطلب کو واضح کیا جائے اور اسے ثابت کیا جائے تو وہ اپنے میں سے پائین ترین افراد کی بات عملی اور اجتماعی موقعیت کے اعتبار سے حق رسیدہ لوگوں کی بات کے ساتھ غیر قابل مقایسہ ہوگی۔ پھر بھی وہ اپنے سے کمترین کی بات کو قبول کر لیتے ہیں اس لئے کہ ان کی اپنی شخصیت

بہت زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ اور یہ ان کے منصف مزاج ہونے کی دلیل ہے اور یہی اسلامی تربیت کا اصول ہے۔

اجازت دیں تاکہ انہی دو توضیحات پر ہی اکتفا کریں۔ انشا اللہ --- بحث کو دوسری دو تین اصلوں کی اساس پر بیان کرتے ہیں اور اس سے تعلیم و تربیت کے چند فروعات استخراج ہوسکتے ہیں۔ اور انسان آزادی اور آگاہی جیسے دو اجزا سے سرشار ہے پس وہ اپنا اور جامعہ کا مسئول ہے۔

واقعیات کے بیان کرنے میں مغالطہ

آج کی فارسی میں معمولاً" تجربی شناخت' علمی شناخت اور تجربی علم پر "علم" کا اطلاق کیاجاتا ہے۔ اس ترتیب سے ---- علم کے مخصوص معنی میں محدودیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دانش اور آگاہی کے لئے یورپی زبانوں میں عام معنی استعمال ہوا ہے ہر قسم کی آگاہی کو شامل ہے۔ اور اس کے لئے ایک خاص کلمہ وضع کیا گیا ہے۔ انگریزی میں Knowledge کہتے ہیں اور تجرباتی دانش کے لئے Science کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن فارسی میں نالج اور سائنس دونوں کے لئے لفظ علم استعمال ہوا ہے۔

آج کی فارسی میں کلمہ علم لفظ مشترک کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کا اصل معنی وسیع اور جدید معنی محدود ہے۔ ان دونوں معنی کے درمیان ایک گمراہ کنندہ مغالطہ زمینہ ہموار کئے ہوئے ہے۔ اس مغالطہ کی ترکیب یوں متصور ہے:۔

۱۔ اگر کسی کلمہ کی معرفت علمی نہ ہو تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اور صرف علمی معرفت ہے کہ اس کی بنیاد پر واقعیت کا ازعان کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کو

اس کے ذریعے سندیت اور اعتبار بخشا گیا ہے۔

بنا براین _____ غیر مادی امور جو کہ شناخت تجربی کے قابل نہیں ہیں اور ان کا تجرباتی آزمائش گاہ میں تجربہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ان غیر مادی امور کی کوئی واقعیت نہیں ہے' یہ سوائے ذہنی تصورات اور خواب و خیالات کے کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ REALISM ایسا فلسفہ ہے جو صرف مادہ کو حقیقت سمجھتا ہے۔

(IDEALISM) (تصورات ذہنی) ایسی جہان بینی ہے جس میں غیر مادہ کے معتقد ہیں۔ فطرت حکم لگاتی ہے کہ REALISM (واقع بینی' واقع گرائی) IDEALISM (تصورات ذہنی) پر مقدم ہیں۔ پس ان لوگوں کے خیالات کے مطابق جہان بینی الٰہی جہان بینی پر مقدم ہے ______ یہ کس قدر آشکارا بات ہے !!

پہلی توضیحات میں غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ _____ یہ بات کس قدر غیر علمی ہے۔ اور درحقیقت مغالطہ ہے۔ اگر REALISM (بمعنے واقع بینی) اور IDEALISM کو بمعنے تصور و خیال قبول کرلیں کہ REALISM' IDEALISM پر مقدم ہے۔ ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ REALISM اور اس کی واقعیت کس قدر ہے؟ اور حقیقتاً" REALIST کیا ہے؟

حق کی عمومیت

REALISMایک ایسی واقعیت ہے جو حقیقت میں وجود رکھتی ہے۔ یہ واقعیت ممکن ہے کہ مادی ہو یا غیر مادی ہو۔ ہر وہ شے جو موجود ہے اس کے لئے لازمی نہیں ہے کہ ____ وجود بھی رکھتی ہو۔ جیسا کہ ہر وہ شے جو علم ہے ضروری نہیں ہے کہ اس کا مشاہدہ بھی کیا ہوا ہو۔

بنا بر ایں ______ REALISM الٰہی آگاہانہ اعتقاد اور مادی و غیر مادی حقائق کے علم کا دوسرا نام ہے اور تصورات ذہنی کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

جو جہان بینی الٰہی کے معتقد ہیں کہتے ہیں کہ:

میں اپنی عقل، اپنی بصیرت، اپنے علم اور آگاہی کے وسیلے سے اس مجرد حقیقت تک پہنچا ہوں اور اسے حاصل کیا یوں نہیں کہ اس کا خیال کیا۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس حقیقت کو بالکل برعکس طریقے پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اور برعکس اس کی تفسیر ہوئی ہے۔

دینی اور IDEALISM (تصورات ذہنی) اعتقادات۔

یہاں ہم کہتے ہیں کہ ______ ہم IDEALISM یعنی تصورات ذہنی کی نفی کرتے ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے کہ ایک موحد اور خدا پرست انسان ان ذہنی تصورات کا انکار اور ان کی نفی کرے۔

وہ IDEALISM قابل انکار ہے جس کا یوں تصور پیش کیا جائے۔

IDEALISM ایسی شے کا اعتقاد بنانا ہے جو صرف تصور ہو اور اس کی کوئی حقیقت نہ ہو یہ بعینہ وہی خرافات پرستی' خرافات دوستی' افسانہ بازی اور توہمات کا مجموعہ ہے کہ جن کے خلاف قرآن مجید نے مبارزہ کیا ہے۔

پس ہم بھی ایسے IDEALISM کا انکار کرتے ہیں جو تصورات ذہن کی حد تک ہوں اور ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ مثلاً" فلاں شے شفا دیتی ہے۔ فلاں شے کا فلاں اثر ہے۔ یہ طلسم اور جادو اس طرح کام دکھاتا ہے اور انسان ایسا ہی سمجھ بیٹھے تو یہ ایسی شے ہے جسے بنایا گیا ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

البتہ!

اس کے مصادیق کی تعیین میں دقت سے کام لینا چاہئے۔ کیونکہ بسا اوقات ایک ملحد شخص ہماری بہت سی واقعیات کو ذہنی اختراع قرار دے دیتا ہے۔

مثلاً"

ممکن ہے آپ سے کہے جن کیا چیز ہے؟ فرشتہ کیا چیز ہے؟ وہ ملحد کہے گا کہ فرشتہ ایک ذہنی و خیالی شے ہے جس کا واقعیت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ آپ کے ساتھ ایسے پھیر پھیر کر باتیں کرے گا کہ وہ چیزیں جو محسوسات میں سے نہیں ہیں انہیں IDEALISM (ذہنی تصورات) قرار دے دے گا۔ مثلاً"

فرشتہ، لوح، قلم، عرش، کرسی ____ یہ سب غیر محسوسات ہیں وہ پہلے پہل تو انہیں خرافات اور توہمات سے تعبیر کرے گا پھر بعد میں انہیں ذہنی اختراع قرار دے کر IDEALISM کے عقیدہ میں داخل کر دے گا۔ ہم سب سے پہلے اس کے قضیہ کے صغریٰ کو لے لیتے ہیں بایں معنی کہ

ہم ملحدین کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم بھی توہمات پرست نہیں ہیں۔ آپ نے جن چیزوں کو IDEALISM قرار دیا ہے ہم ان کی نفی نہیں کرتے۔ ان چیزوں کے بارے میں جداگانہ طور پر بحث ہونی چاہئے۔

جن، لوح، عرش کی واقعیت ہے (یعنی حقیقت اور واقع میں ان کا وجود ہے) ممکن ہے ملحدین تو معجزہ کو بھی موہوم قرار دیں مثلاً"

حضرت موسیٰؑ کے عصا کے اژدھا بننے کو موہوم قرار دیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ ایک واقعیت ہے اور ہم وہم پرست نہیں ہیں۔ البتہ دیکھا جائے کہ موہوم ہے (یہ نہ

(ہم اس مدعا کو کہ کہتے ہیں "فرشتہ کے بارے عقیدہ وہم ہے" رد کرتے ہیں

ہو کہ زبردستی کرتے ہوئے ہر شے کو موہوم قرار دے دیا جائے) اور چونکہ یہ کم فرصتی کام ہے لہٰذا یہ بحث کرنے کا یہاں مورد نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس سینکڑوں آیات و روایات ہیں جن میں ان کی واقعیت کی بابت بحث صادر ہوئی ہے آپ تحقیق کریں کہ کونسی روایات صحیح اور کونسی ضعیف ہیں۔

اور جو روایات صحیح نہیں ہیں ان چیزوں کو ہم IDEALISM قرار دیتے ہیں لیکن چونکہ یہ سب واقعیت رکھتی ہیں لہٰذا ہمیں ثابت کرنا چاہیے کہ ان کا تحقیق واقعیت اور اصالت ہے۔

بنا بر ایں ____ ہم ان کے کلی قضیہ کو قبول کرتے ہیں لیکن قضیہ کے صغریات اور خاص موارد قابل قبول نہیں ہیں۔ کیونکہ بہت سے موارد ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں ملحدین موہومیت کے قائل ہیں اور ہم ان کی موہومیت کے قائل نہیں ہیں۔

IDEALISM میں موہوم اور ہدف کے درمیان تفاوت

IDEALISM ہمیشہ موہوم گرائی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو یہ عقیدہ بہت جالب ہوتا ہے مثلاً"

ایک شخص جان بوجھ کر میدان جنگ میں جاتا' جہاد کرتا اور شہید ہو جاتا ہے۔

یا فرض کریں مولا علی بن ابی طالبؑ محراب عبادت میں جاتے ہیں یا میدان جنگ میں جاتے ہیں ____ ان کے ذہن میں ایک ہدف اور مقصد ہوتا ہے وہ ہدف کیا ہے؟

ہدف صرف دشمن کا خاتمہ اور انسان کی قدرت کا استحکام ہوتا ہے کیا اس مومن اور مجاہد کے ذہن میں جس وقت یہ ہدف آتا ہے اس وقت IDEALISM (ذہنی تصور) کا عقیدہ ہوتا ہے

جب حضرت علیؑ خیبر کے قلعہ کی طرف بڑھے یا پیغمبر اسلامؐ فتح مکہ کے لئے جا رہے تھے تو کیا خیبر کا دروازہ کھل چکا تھا اور مکہ فتح ہوچکا تھا؟ کیا اس وقت اسلام مستحکم اور خانہ کعبہ پر علم اسلام نصب ہوچکا تھا؟

یعنی:

جس وقت پیغمبر اسلامؐ مکہ معظمہ کو فتح کرنے کے لئے اپنے مجاہدوں کو ہمراہ لئے ہوئے چلے ____ تو اس وقت یہ ایک ایسی آروز تھی جس کی کوئی واقعیت اور حقیقت نہ تھی۔ لیکن اس ذہنی تصور کی اس قدر مضبوط اور واقعیت سے ہمکنار حیثیت تھی کہ اس ذہنی تصور کے لئے ہر ایک جان دینے کے لئے حاضر تھا۔

یہاں ہم کہتے ہیں کہ ____ یہاں ایک ہدف ہے۔ جس سے ایک ایمان مطرح ہوتا ہے۔ اور یہاں دوسرا مسئلہ بمعنی تصور موہوم نہیں ہے۔ اگرچہ ابھی تک REALISM کا تحقق خارجی پیدا نہیں ہوا۔ لہٰذا کسی محقق کو تحقیق کے لئے، کسی مکتشف کو اکتشاف کے لئے، کسی مجاہد کو جہاد کے لئے، کسی مبلغ کو تبلیغ کے لئے، کسی مصلح کو اصلاح کے لئے ____ خطرات اور رنج اور سنگلاخ راستہ درپیش ہے۔

اور ان کا ایک ایسی شے پر ایمان ہے ____ کہ جس کی ابھی تک کوئی واقعیت نہیں ہے۔ سرطان کا عالم اس کے علاج کو کشف کرنے کے لئے دل و جان سے کوشش کرتا ہے حالانکہ ابھی تک اس کا علاج کشف نہیں ہوسکا بلکہ صرف اور صرف ذہنی تصور ہے لیکن اس ہدف پر ایمان ایسے ہے کہ اس کام کا انجام دینا ضروری

ہے تاکہ علاج دریافت کیا جاسکے۔

ایک شخص جامعہ کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ دشمن پر کامیابی اور فتح حاصل کرنا چاہتا ہے ___ جو ابھی تک حاصل نہیں ہوئی فقط ذہن تک محدود ہے اور وہ اس کام کے لئے جان تک قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔

اسی ترتیب سے ____ ایسے اشخاص کو ہدف گر' آرمان گر اور IDEALIST قرار دیا گیا ہے۔ اور وہ ایک شے سے دل لگائے ہوئے ہیں جو ابھی تک صرف خیال ہی ہے۔ پس ان کی بابت تمام تر کوششوں کو صرف کریں۔ لہٰذا ہم IDEALISM کا اس تفسیر کے مطابق انکار نہیں کرتے۔ بلکہ ہم تو اس IDEALISM کو رد کرتے ہیں جو فلاسفہ کے نزدیک مصطلح ہے۔

حقائق تک پہنچنے کے لئے علمی آگاہی

ہم ان مباحث سے ایک نکتہ کا استفادہ کرتے ہیں کہ حق کی نسبت علمی آگاہی کا ایک عام معنی ہے۔

یعنی حتی کہ اللہ تعالیٰ پر عقیدہ کے سلسلے میں اگر کوئی شخص تقلید' گمان یا کسی کی بات سن کر معتقد ہو جائے تو یہ اس کا معیاری عقیدہ نہیں ہوگا اور ممکن ہے کہ بہت جلد اس کا عقیدہ ختم ہو جائے اسی لئے تاکید کی گئی ہے کہ اصول دین میں دلیل کے ساتھ عقیدہ ہونا چاہئے۔ پس ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ____ اگر ہم حقیقت اور واقعیت کو عمومیت دیں تو ان تک پہنچنے کے لئے علمی طریق سے استفادہ کرنا ضروری ہوگا نہ یہ کہ ہم کہیں کہ:

خدا ہے اور خدا کا احترام محفوظ ہے یا میں جس طرح سے بھی وحی کا اعتقاد

رکھوں کافی ہے۔

بلکہ کہا جائے کہ آج کے دور میں بہت زیادہ مکاتب فکر ہیں اور علمی و فلسفی مکتب میں بہت زیادہ کام ہوچکا ہے لہٰذا کسی درست شے کا اعتقاد رکھنا کافی نہیں بلکہ وہ اعتقاد ہو جس میں آگاہی اور استدلال ہو۔

اس کے بعد ______ اجتماعی، علمی و آگاہی والی قضاوتیں طبعی اور علمی مسائل میں قطعی مستندات کے ساتھ ہونی چاہئیں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا دینی معاشرہ اس ظن و گمان کی کیفیت میں گرفتار ہے۔ خیال، گمان، تخمینہ سازی اور فرضی باتوں کو اجتماعی قضاوتوں میں بہت زیادہ مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

کوئی ایک شخص ایک بات کو بیان کرتا ہے۔ وہ مختلف لوگوں سے گزر کر دائرہ عام میں آتی ہے۔ پھیلتے پھیلتے ہر عام و خاص کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک واقعیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس سلسلہ میں لوگوں کی آبرو اور اہمیت کو گھٹایا جاتا ہے۔ تہمتوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان تمام چیزوں کی بنیاد توہمات، ہوا و ہوس اور گمان ہے۔ لہٰذا ایسا کرنے سے قبل بہت زیادہ تاکید سے کام لینا چاہئے۔

حق کو قبول کرنے کے تربیتی نتائج

اس بحث (اصول تعلیم و تربیت) کے مجموعہ سے چند ایک تربیتی نتائج کا استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ پہلے حصہ میں ان کی بابت اشارہ کیا جاچکا ہے۔

الف۔ تفاوت سفسطہ و استدلال

پہلا تربیتی نتیجہ :- ہم آہستہ آہستہ بڑی کلاسوں کے طلبا میں سفسطہ اور وسوسہ کی

آشنائی کرائیں گے۔ اور ان کے فرق کو منطق اور استدلال کے ساتھ بیان کریں گے۔

مثلاً" ـــــــ یہی بحث جو بیان ہو چکی ہے اس میں پہلے علم کی حقیقت کی تعریف نہیں کی بلکہ اسے علم تجربی (Science) کے معنی میں بیان کیا ہے۔ بعد میں نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں علم گرہوں اور تم ایک شے کا اعتقاد رکھتے ہو جو علم تجربی کے دائرہ سے خارج ہے۔ لہٰذا تم ذہن گر ہو۔ تم اپنے استدلال میں سفسطہ کر رہے ہو۔ یعنی تم نے ایک شے کو دوسری کی جگہ پر رکھا ہے اور نہایت مہارت کے ساتھ اس کے قریب سے ایسے گزر گئے ہو گویا وہ ثابت شدہ اصل ہے۔

ہم طلبا کو سمجھائیں کہ وہ اپنے استدلال کو لغزشات سے بچا کر کیسے درست کر سکتے ہیں۔ استدلال میں فریب اور استدلال میں وسوسہ کو علمی اصطلاح میں سفسطہ کہا جاتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ طلبا کو اس سے آشنا کریں کہ ایک استدلال میں دھوکا اور فریب کیسے ممکن ہے۔

مثلاً" ایک تحریر یا ایک تصویر جو بورڈ پر بنی ہوئی ہو اس کی بابت بچوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسے بوجھیں تاکہ ہم بعد میں انہیں صحیح صورتحال سے آگاہ کریں اور ہدایت کریں۔

یا جو اشعار بچے کہیں یا کوئی تحریر اور کتاب جو بچوں کو مطالعہ کے لئے دی جائے اب بچے اس کے بارے میں بحث و قضاوت کریں۔ اگر کسی مورد میں بچوں سے کوئی غلطی سرزد ہو یا کہیں وہ پہلو تہی کر رہے ہوں تو ہم ان کی تصحیح کریں اور تصحیح کر کے سمجھائیں۔

ہمیں چاہئے کہ ان مسائل کو ان شوریٰ میں بیان کیا جائے جو ان موضوعات کے بارے میں منعقد ہوں۔ تاکہ وہ مطالب خوب روشن ہو جائیں۔ اگر بعد میں ہم متعدد

مسائل کو زیر استفادہ قرار دیں تو اس کے اصول اور بنا کو واضح ہونا چاہئے۔ ورنہ اگر ان کے استدلال میں سستی کی گئی تو ـــــ اس سے مختلف نتائج بر آمد ہوں گے

ب۔ واقع بینی میں گسترش

تربیت کے سلسلہ میں دوسرا تذکر یہ ہے کہ ہم ابتدا ہی سے بچوں کے لئے بنیاد کو درست کریں اور غیبی مسائل مثل خدا' وحی' قیامت' فرشتے ـــــ اس طرح بیان کئے جائیں گویا کہ وہ انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کے ذہن میں کوئی تاریک پہلو باقی نہ رہ جائے۔ کہیں سقم نظر آئے تو استدلال اور توجیہ کے ذریعے اسے حل کیا جائے۔

ایک عیسائی دانشمند جو کہ مختلف چیزوں کو کشف کئے ہوئے تھا اور بعض فلسفی آرا میں الحادی نظریات رکھتا تھا' حضرت عیسیٰؑ کا معتقد تھا۔ اور انہیں پاک اور مقدس سمجھتا تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا ذہن علمی اور فلسفی ہے اور سالہا سال تحقیق کرتے کرتے گزار دیے ہیں اور اب بھی حضرت مسیحؑ کو ایک مقدس وجود سمجھتے ہو؟ اس نے کہا میں کیا کروں؟ بچپن میں اور کلیسائی مدرسوں میں دوران تعلیم حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اس قدر تلقین کی گئی کہ اب میں انہیں اپنی روح اور جان میں سمایا ہوا پاتا ہوں۔ ورنہ اس عقیدہ کے خلاف متعدد استدلال پیش کر سکتا ہوں۔ اور انہیں فلسفی طریق سے ثابت بھی کر سکتا ہوں کہ حضرت مسیحؑ خدا نہیں ہیں لیکن کیا کیا جائے بچپن میں ان کی عظمت اس قدر ذہن میں بٹھا دی گئی ہے کہ وہ اصلاً میری روح سے جدا نہیں ہو سکتے۔

اب دیکھا جائے کہ استدلال اور بحث کیسے ہونی چاہئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ غیبی مسائل بچوں کے ذہنوں میں پیار اور محبت کے ساتھ واضح کئے جائیں۔ البتہ اس

سے مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ غلطی اور خطا کے پہلو رکھتے ہوں تب بھی بتائے جائیں بلکہ انہیں واقعیت و تحقق شناسی کرائی جائے تاکہ مسائل غیبی مثلاً" خدا، غیب، امام زمانہؑ، قیامت، سورج، چاند، گھاس ____ سب اس کے لئے اس طرح روشن و آشکارا کئے جائیں کہ وہ اس کے ایمان کا جز بن جائیں۔ البتہ روش، شیوہ اور اس کی بحث کے وسائل تقاضا کرتے ہیں کہ ان کے بارے میں مستقل بحث کی جائے۔ یہ تربیتی نتیجہ مہم ہے کہ غیبی مسائل بچے کے ذہن میں راسخ کئے جائیں ____ تاکہ بعد والے مسائل میں اس کا اعتقاد بہت زیادہ موثر ہو۔

بیوی اور شوہر کے آپس میں روابط

ارشاد پروردگار ہے:

"ومن اياته ان خلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها و جعل بينكم مودة و رحمة------" ؎ (سورہ روم آیت ۲۱)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے ہی نفسوں سے بیویوں کو پیدا کیا۔ تاکہ تم ان کے ساتھ سکون محسوس کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور نرمی (رحمت) کو قرار دیا۔

وہ مسئلہ جس میں ہم بطور کلی بحث کریں گے یہ ہے کہ:

کون سے شرائط ہیں کہ جن کی بنا پر میاں بیوی کے گھریلو اور داخلی معاملات محکم اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان صمیمیت و صفا اور محبت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور یہی طریقہ کار دائمی ہو تاکہ اس کے نتیجہ میں بچوں کے رشد کے لئے ایک مناسب ماحول وجود میں آئے۔

ہم ابتدائی طور پر عرض کرتے ہیں:

واضح سی بات ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان لڑائی، جھگڑا، بحث و تکرار اور ناخوشگوار حالات ہوں گے تو اس سے بچوں کی روحانی اور اخلاقی تربیت بلکہ ان کی پیش رفت پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ اتفاقاً" عورت اور مرد آپس میں تکرار، اختلافات اور میں نے یہ کیا تم نے وہ کیا ----- کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی جھگڑا اتنا بڑھ جاتا ہے کہ مار پیٹ کی نوبت آجاتی ہے۔

اس صورتحال میں گوناگوں اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور ان چیزوں کا وجود مختلف خاندانوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ ایسا ماحول یقیناً" بچے کو پریشان کر دیتا ہے اور ایسی

صورتحال میں وہ اپنا کام صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکتا۔ اور تعلیم بھی جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس سے اس کی صحیح تربیت اور پرورش نہیں ہو پاتی بچہ جب گھر میں لڑائی، جھگڑا اور گالی گلوچ سنتا ہے تو اپنے اندر محبت اور انس کو محسوس نہیں کر سکتا۔

لہٰذا اس پر یوں بحث کی جائے کہ کیا کیا جائے ---- تاکہ میاں بیوی کے درمیان پیار اور محبت زیادہ ہو سکے۔ کیونکہ اس کا بچوں کی تربیت اور پرورش پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔

شادی اور اسلام

اس بحث کا دوسرا مقدمہ:

چند آیات کا ترجمہ بیان کیا جاتا ہے تاکہ شادی کی بابت اسلام کا نقطہ نظر واضح ہو جائے جو مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

(الف)۔ سکون، مودت، رحمت

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجالتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ" (سورہ روم ۲۱)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے ہی نفسوں سے بیویوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کے ساتھ سکون محسوس کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور نرمی (رحمت) کو قرار دیا۔

یعنی شادی سے ایسا ماحول وجود میں آئے جس میں سکون اور راحت ہو۔ امن

اور آرام ہو۔ خانوادہ کا ماحول اضطراب، تشویش اور بے اعتمادی کا نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس میں امن، آرام اور اطمینان ہو۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان محبت، پیار، امن، سکون کو قرار دیا ہے پس عورت سے تین چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ سکون و محبت و رحمت۔

ب --- دو زندگیوں کا معاملہ

قرآن مجید میں ایک اور تعبیر ہے جسے آیت نے براہ راست بیان نہیں کیا۔ بلکہ چند اور مطالب کو بیان کیا ہے۔ لیکن ہم بالواسطہ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

عورت کے انتخاب اور ENGAGEMENT کے بارے میں ارشاد پروردگار ہوتا ہے:

"الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات ---" (سورہ نور/۲۶)

ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے ہیں نیک اور اچھی عورتیں نیک اور اچھے مردوں کے لئے ہیں اور نیک اور اچھے مرد نیک اور اچھی عورتوں کے لئے ہیں ۔

یہاں ایک وصیت اور نصیحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

نیک اور پاک دامن مردوں ---- اور عورتوں کو تلاش کیا جائے ایک پاک دامن عورت اور ایک پاکدامن مرد کو پیش نظر رکھیں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے یہ

یہ بحث فقہی حوالے سے ایک خصوصیت کی حامل ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آیا طیب سے مراد پاک دامن اور عفیف ہے یعنی اہل زنا اور آلودہ نہ ہو۔ اور کیا ان سے ہی شادی کرنا واجب ہے۔ آیا نیک کی بد کے ساتھ شادی اصلاً" جائز نہیں ہے۔ یا یہ مسئلہ بعد میں منسوخ ہوا ہے ہمارا اس فقہی بحث سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

پاک مرد اس پاک عورت کے لئے ہے۔ اور یہ پاک عورت اس پاک مرد کے لئے ہے۔ یعنی دونوں آپس میں برابری والوں کے ساتھ بندھن جوڑیں۔ اس مسئلہ میں نہایت دقت سے کام لیں کیونکہ یہ دو زندگیوں کے باہمی پیوند کا معاملہ ہے۔ یہ جان اس پر اور وہ جان اس پر مقدم ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا بدل واقع ہوتے ہیں۔ کیا یہ بدلیت بایں معنی ہے کہ مرد جنسی ضرورتوں کو پورا کرے اور اس کے عوض نفقہ اور سرمایہ دے؟

اسے خرچ دیا جائے تاکہ وہ اپنے امور حیات کو صحیح طور پر چلا سکے؟ یعنی وہ اسے زندگی بسر کرنے کے لئے خرچ دے؟

"**الطیبات للطیبین**" ایک جان دوسری جان کے مقابلے میں۔ دو جانوں کے درمیان پیوند اور جوڑ ہے۔ ظاہری، مالی، جنسی مسائل سب کے سب اصل مسئلہ کے فروع ہیں اور میاں، بیوی کے حقوق کا ایک سلسلہ ہے جو اس پیوند کے اثر میں ایجاد ہوتا ہے۔ پس اس تعبیر کو پیش نظر رکھیں کہ شادی دو نفوس اور جانوں کے درمیان پیوند ہے۔

ج ---- میاں، بیوی ایک دوسرے کے لئے لباس ہیں۔

بیوی اور شوہر کے بارے میں قرآن مجید نے ایک اور تعبیر بھی بیان کی ہے:

-----**ھن لباس لکم و انتم لباس لھن** ------ (سورہ بقرہ ۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

تمہاری عورتیں تمہاری شخصیت کی حفاظت کے لئے، پاکدامنی، عفت اور تمہاری آبرو کے لئے تمہارا لباس ہیں اور تم بھی اپنی عورتوں کی شخصیت کی حفاظت اور آبرو و پاکدامنی کے لئے ان کا لباس ہو۔

یعنی خانوادہ کا ہر فرد دوسرے کی شخصیت اور عزت و آبرو اور پاکدامنی کے لئے

ہے۔

عورت کو مرد کا اور مرد کو عورت کا احساس ہونا چاہیئے اور ایک دوسرے کی شخصیت کا خیال رکھنا چاہیے۔ پس عورت مرد کی پناہ میں اور مرد عورت کی پناہ میں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے واسطے عفت، شخصیت، آبرو اور حیثیت کا ستون ہیں۔

د---- میاں، بیوی کی مشترک خلقت کا سرچشمہ کیا ہے

قرآن مجید میں ارشاد پروردگار ہے:

هو الذی خلقکم من نفس واحدة وجعل منهازوجها لیسکن الیها" سورہ اعراف آیت ۱۸۹

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے خلق فرمایا۔ اور اسی نفس واحدہ سے زوجہ کو بنایا تاکہ وہ اس کے ساتھ انس اور آرام کو حاصل کرے۔

یہ کس قدر لطیف تعبیر ہے۔ کیونکہ توریت میں یہ مسئلہ اس طرح معروف ہے کہ حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے حضرت حوا پیدا ہوئیں۔ یعنی پہلے حضرت آدمؑ خلق ہوئے اور بعد میں ان کی بائیں پسلی سے حضرت حواؑ کو خلق کیا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مرد کی بائیں پسلیوں میں دائیں پسلیوں کی نسبت ایک پسلی کم ہے یہ مسئلہ اسرائیلی (بنی اسرائیل کا) ہے۔ جو کہتے ہیں کہ عورت کا وجود مرد کے طفیل ہے البتہ ان پسلیوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ

اے لوگو! تم سب کا سرچشمہ اور اصل ایک شے ہے۔ یعنی تم سب کا باپ دادا

ایک ہی ہے۔ اسی جنس اور اسی نفس سے اس کی بیوی کو بنایا گیا جس جنس و نفس سے خود اس کو بنایا گیا تھا یعنی حضرت حواؑ کی خلقت بھی اسی نفس سے ہوئی۔ وہ بھی اسی جان کا سرچشمہ ہے۔ نہ یہ کہ حضرت حواؑ حضرت آدمؑ کے جسم کا ٹکڑا ہے۔

لہٰذا ہمارا نتیجہ ان اہل توریت کے برخلاف ہے۔

۵ حق مہر محبت کی علامت ہے

حق مہر ایک شرعی مسئلہ ہے۔ ضروری ہے کہ عورت کے لئے حق مہر مقرر کیا جائے۔ قرآن مجید میں یہ عوض کے طور پر کہیں بھی وارد نہیں ہوا۔ یعنی عورت کے وجود سے جو فائدہ لینا ہے اس کے عوض میں حق مہر سرمایہ دیا جائے۔ حاشا و کلا یہ قرآن مجید میں عوضیت کے حوالے سے وارد نہیں ہوا۔

قرآن مجید میں ہے

واتوا النساء صدقاتهن نحلة سورہ نساء /۴

عورتوں کو حق مہر پیش کش کے طور پر دے دو۔

"صدقات" حق مہر کے مورد میں بہترین تعبیر ہے۔ صداق کی اصل صدق و صداقت سے ہے یعنی صداق وہ ہدیہ ہے جو پیار اور محبت کی علامت ظاہر کرتا ہے اگر آپ کبھی سفر پر جائیں اور اس مسافرت سے واپسی پر کسی دوست کے لئے چھوٹا موٹا ہدیہ لے آئیں تو اس ہدیہ سے آپ اپنے دوست کے ساتھ محبت، ارادت قلبی اور روابط کی وسعت کا اظہار کرتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہدیہ قیمتی ہو یا کم قیمت والا۔ بلکہ بات یہ ہے کہ آپ کا دوست کہے گا کہ اس نے مجھے وہاں بھی فراموش نہیں کیا۔ یہ صداقت دوستی کی علامت ہے۔ بنا براین حق مہر بھی دوستی اور محبت کی علامت ہے۔

اسے نحلۃ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ تعبیر بھی بہترین ہے۔ نحلۃ یعنی پیشکش و تقدیم ہے عوض اور بدلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایسا ہدیہ ہے جو بیوی کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ پس حق مہر صداقت کی علامت اور ہدیہ ہے۔ *

پانچ عدد نصیحتیں

اب کیا کیا جائے اور کن شرائط کے مطابق زندگی بسر کی جائے تاکہ بیوی اور شوہر کے درمیان تعلق، مودت، رحمت، سکون، آرام محفوظ رہے۔ اور ان کی ازدواجی زندگی خوشحال رہے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ سننے میں نہ آئے۔

اب ہم چند اصول کو بیان کرتے ہیں کہ جن پر عمل پیرا ہو کر ہر بیوی اور اس کا شوہر اپنے گھر کو اپنے لئے جنت بنا سکتے ہیں۔ اور ان کی ازدواجی حیثیت برقرار رہ سکتی ہے البتہ یہ بحث میرے لئے بھی نئی ہے میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے اس بحث کو دقیقاً" منظم کیا ہوا ہے۔ میں نے یہاں پانچ اصلوں کو منظم کیا ہے۔

آپ ان سے زیادہ بھی بیان کر سکتے ہیں۔ یا انہی اصولوں کے بارے میں بحث کریں۔ ان تمام اصولوں میں طرفین کے بارے میں بات کی گئی ہے یعنی بیوی اور شوہر دونوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ اور کتنا اچھا تھا کہ شوہر کے اصول الگ اور بیوی کے اصول الگ بیان کئے جاتے۔ جب مردوں کو وصیت و نصیحت کرتے تو عورتیں نہ سنتیں

* یہ سب مطالب ایک بحث میں وارد ہونے کے لئے مقدمہ تھے۔ ورنہ ہم جانتے ہیں کہ مسئلہ ازدواج اور وہ ابحاث جو طلاق کے بارے میں پیش آتی ہیں وہ رابطہ جو عورت اور مرد کے درمیان ہے اور وہ حقوق جو عورت اور مرد کے درمیان قائم ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی آیات ہیں کہ جن سے بہترین نکات کا استخراج ہوسکتا ہے

اور جب عورتوں کو وصیت و نصیحت کرتے تو مرد نہ سنتے۔ کیونکہ عجیب بات ہے کہ جب مردوں کو نصیحت کریں گے تو عورتیں کان کھول کر توجہ سے سنیں گی کہ ان کے بارے میں کیا کہا جارہا ہے۔ تاکہ اسے خوب یاد کرلیں۔ اور جب عورتوں کو نصیحت کریں گے تو مرد غور سے سنیں گے کہ ان کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔ تاکہ اگر بعد میں کوئی ایک وظیفہ میں کوتاہی کا مرتکب ہو یا سرانجام نہ دے تو وہ ایک دوسرے کو متہم قرار دیں۔ للذا خواہش کروں گا کہ جب مردوں کو وصیت اور نصیحت کروں تو وہ اپنے فرائض کو توجہ کے ساتھ سمجھیں اور جب عورتوں کو نصیحت کروں تو وہ بھی اپنے فرائض کو توجہ کے ساتھ سمجھیں۔

الف عورت اور مرد ایک دوسرے کے کام کو پیش نظر لائیں۔

اصول اول کام اور توقعات کے سلسلے میں ہے جو عورت اور مرد ایک دوسرے سے گھر کے اندر اور باہر رکھتے ہیں۔ مردوں کے بارے میں ابتدا کی جاتی ہے۔

مرد گھر سے باہر مشقت اور زحمت برداشت کرتا ہے۔ وہ کام یا فکری ہوگا یا دفتری ہوگا یا تدریسی ہوگا یا کاریگر کا ہوگا یا کوئی اور کام۔

مرد چھ سے دس گھنٹے تک مسلسل مشقت و ناراحتی کا کام کرتا ہے۔ اتنا کام کرتا ہے کہ کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ میری بیوی تو گھر میں آرام سے ہے میں ہی ہوں جو ہر وقت تکلیف میں ہوں۔ میری بیوی تو گرمیوں میں ٹھنڈی اور سردیوں میں گرم جگہ پر رہتی ہے اور راحت و سکون میں ہے۔ وہ تو بس صرف جھاڑو دیتی اور تفریحی طور پر کھانا پکا دیتی ہے حالانکہ میری زندگی مشقت اور درد سر پر مشتمل ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اس شوہر کو اپنا کام ہی نظر آتا ہے عورت کے کاموں اور

مشقتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب وہ گھر لوٹتا ہے تو اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ یہاں دو فرد ہیں ایک میں جو سارا دن کام کاج میں مشقت برداشت کرتا رہا اور دوسری میری بیوی جو گھر میں بے کار آرام سے بیٹھی رہی ہے۔ اب جب ایک تھکا ماندہ شخص ایسے شخص کے پاس آئے جس نے سارا دن فارغ گزار دیا ہو تو وہ شخص دوسرے کے بارے میں کیا توقع کرے گا؟ اس کی توقع یہ ہوگی کہ میری بیوی سارا دن تو فارغ رہی ہے اب میں جو کچھ کہتا جاؤں فوراً" اس کی تعمیل ہوتی جائے۔

بنا برایں کئی ایسے شوہر ہیں جو بیوی کے گھریلو کاموں کو کسی شمار میں نہیں لاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر بیٹھتے ہیں اور اس کی طاقت سے بھی زیادہ بوجھ اس پر ڈال دیتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اب جبکہ میں گھر آگیا ہوں اور میرا کام کل تک ختم ہوگیا ہے اب میں گھر میں فارغ رہوں اور بیوی اب بھی بچوں کو سنبھالے اور دوسرے کاموں کو سرانجام دے۔

اگر مرد اس مسئلہ پر توجہ کرے اور باریک بینی سے سوچے کہ اگرچہ میری بیوی کو وہ زحمات اور تکالیف نہیں اٹھانا پڑیں جو میں نے برداشت کی ہیں لیکن پھر بھی وہ گھر میں فارغ تو نہیں بیٹھی رہی سارا دن کام کاج میں مصروف رہی ہے جس طرح میں تھک کر آیا ہوں یہ بھی تھک چکی ہے؟ یعنی اگر ہم صحیح قضاوت کریں اور بیوی کی جگہ پر کچھ دن کام کریں تو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ یہ گھریلو کام کس قدر مشکل ہے۔

ممکن ہے کہ شوہر کا کام تحقیق، فکر اور مطالعہ ہو یا اجتماعی و اداری امور کا مسئول ہو یا کسی مدرسہ کا پرنسپل یا کسی کارخانہ کا کنٹرولر ہو لیکن بیوی بھی کوئی کم کام نہیں کر رہی بچوں کی اور گھر کی صحت و صفائی کا خیال اور کھانے پکانے کی زحمت سرانجام دے رہی ہے جس کے نتیجہ میں وہ بھی تھک جاتی ہے۔ اس کے اعضا بھی ہر وقت حرکت

میں ہیں۔ زحمت' تکلیف' روحی شکنجہ اس کے لئے بھی ہے۔ اگر کھانا تیار کرتے وقت نمک زیادہ ڈال بیٹھے یا مرچ زیادہ ڈال دے یا انہیں کم ڈال دے یا سالن کو جلا بیٹھے تو کس قدر ناراحتی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کام کے سلسلہ میں شوہر جتنی مشقت باہر برداشت کرتا ہے سوچے کہ گھر میں بیوی بھی اتنی ہی مشقت برداشت کر رہی ہے۔ اس صورتحال میں جب وہ گھر آئے گا تو آتے ہی حکم نہیں چلانا شروع کر دے گا بلکہ وہ متوجہ ہوگا کہ میری طرح سے وہ بھی تھکی ہوئی ہے۔ اب وہ گھر آکر دلجوئی اور محبت سے پیش آئے گا۔ بات بات پر بگڑے گا نہیں۔ بلکہ بیوی کے کاموں اور اس کی باتوں کی قدر دانی کرے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مرد گھر میں عورت کے کاموں کو کام شمار کرے۔

اس کے برعکس عورتوں کو دیکھا گیا ہے کہ انہیں صرف اپنا کام اور اپنی تکلیف ہی نظر آتی ہے۔ جب شوہر گھر سے کام کے سلسلہ میں باہر نکلتا ہے تو بیوی خیال کرتی ہے کہ وہ تو فارغ سیر سپاٹا کر رہا ہے میں ہی ہوں جو کام کی چکی میں پسی جا رہی ہوں۔

پس جب شوہر گھر واپس آتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ تم تو فارغ رہے دوستوں یاروں کے ساتھ گھوم گھام کے واپس آگئے ہو۔ اب یہاں گھر کا کام خود ہی کرو۔ یعنی عورت کا خیال یہ ہے کہ باہر جو کام ہوتا رہا ہے وہ تو کوئی کام ہی نہ تھا اصل کام تو وہ ہے جو میں کرتی ہوں۔

بیوی کہتی ہے دفتر میں بیٹھے ہی رہے ہو کیا کام کیا ہے۔ یا کہے گی طلبا کو درس ہی پڑھایا ہے کیا کام کیا ہے۔ یعنی وہ ان کاموں کو اہمیت ہی نہیں دیتی اور اگر شوہر مزدوری کرکے آئے تب بھی اسے کسی کھاتے میں نہیں گنتی۔ لہٰذا عورت کو چاہئے کہ وہ شوہر کے کاموں کو حساب میں شمار کرے۔

بنا براین کلی طور پر جب بیوی شوہر کے کاموں کو اور شوہر بیوی کے کاموں کو اہمیت دیں گے اور ایک دوسرے کی مشقت کا احساس کریں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت میں اضافہ ہوگا اور وہ شوہر گھر کو آرام کا خزینہ سمجھے گا۔

بیوی گھر کا ایسا ماحول بنائے کہ میاں بیوی کے درمیان کسی قسم کی ناچاقی پیدا نہ ہو بلکہ بہتری کی صورت کو قائم کیا جائے۔

میں اس درد کو کئی خاندانوں میں کاملا" محسوس کرتا ہوں۔ بعض شہروں میں زیادہ اور بعض میں کم ہے۔ اور بعض طبقات میں زیادہ اور بعض میں کم ہے۔

ب مالی مسائل کی طرف توجہ ہو

اب ہم بیوی کے بارے میں پہلے بحث کرتے ہیں

عورت کئی چیزوں کے بارے میں خاص حساسیت رکھتی ہے۔ مثلا" لباس کے معاملہ میں گھریلو بناوٹ و سجاوٹ کے معاملہ میں' مہمانوں کے بارے میں' لوگوں کی پذیرائی کے بارے میں' دوسرے افراد کو تحفہ دینے میں۔

کچھ عورتیں ایسی ہیں جو اپنے احساسات' تعلقات اور ضروریات کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ فلاں چیز ہمارے پاس کیوں نہ ہو؟ جب میری بہن کے مکان کے پردے اچھے ہیں تو میرے مکان کے پردے کیوں نہ اچھے ہوں؟ فلاں نے اپنی گاڑی تبدیل کر دی ہے ہم نئی گاڑی کیوں نہ خریدیں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ عید نوروز آجائے اور ہمارے گھر اور کمروں کو نئے سرے سے رنگ نہ کیا جائے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم سفر پر نہ جائیں؟ اور یہ مسافرت بھی سنگین خرچہ کی ہوتی ہے۔

اس کے بعد مہمانوں اور ان کے کھانے پینے کی نوبت آتی ہے تو کہتی ہے کہ آج میں چاہتی ہوں کہ فلاں رشتہ داروں یا دوستوں کی دعوت کی جائے؟

آقائی شوہر! کیا آپ بھول گئے کہ پچھلے دنوں ہم فلاں کے ہاں دعوت پر گئے تھے دیکھا تھا انہوں نے کتنی قسم کے کھانے تیار کئے ہوئے تھا؟ کس طرح سے ان کا دسترخوان کھانوں سے بھرا ہوا تھا؟ ہمارا کھانا کیوں کم تر ہو؟

عورت صرف اپنے مختلف قسم کے کپڑوں' مختلف رنگوں کے پردوں اور دسترخوان کی اشیا کو چاہتی ہے کہ بہترین ہوں۔ اس کے بعد دوسروں کو تحفے تحائف دینے کا مرحلہ آتا ہے؟ آج فلاں کی شادی ہوئی ہے لہٰذا انہیں تحفہ دینا ہے؟ آج فلاں مسافرت سے آیا ہے اسے تحفہ دینا ہے؟ یہ ہوگیا ہے وہ ہوگیا ہے لہٰذا تحفہ دینا ہے؟ اور تحفہ بھی ایسا ہو کہ دوسروں کے تحائف کے مقابلے میں بہترین ہو۔

عورت کی توجہ کا مرکز وہ خود' اس کے رشتہ دار' پڑوسی اور دوست ہوتے ہیں۔ اور اپنے ہی اردگرد ان تمام مسائل کو دیکھتی ہے۔ لیکن اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ عید کی رات کتنے پیسے خرچ ہوں گے؟ شوہر کی تنخواہ اور آمدنی کتنی ہے؟ عورت کو یکطرفہ ہو کر نہیں سوچنا چاہئے۔ اسے فقط اچھی چیز دیکھ کر فورا" لے لینے کا نہیں سوچنا چاہئے۔ اگرچہ وہ ان چیزوں کی خوبصورتی اور سجاوٹ کو پسند ہی کرتی ہو۔ اتفاقا" بعض عورتوں کا ذوق بہت اچھا ہوتا ہے۔ عورتیں دیکھتی ہیں کہ بس یہ شے اچھی لگی لے لی اس کے علاوہ بھی کچھ چیزوں کو دیکھنا چاہئے جنہیں عورتیں دیکھتی ہی نہیں ہیں۔

شوہر کی آمدن

اگر شوہر کی آمدنی کافی زیادہ ہے تو پھر بھی اسے ان اصولوں کی رعایت کرنا چاہئے جو اسلام کے ایک اجتماع کی سالمیت اور روابط کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اور اسے اسراف و فضول خرچی سے بھی پرہیز کرنا چاہئے۔ تجمل دوستی اور اپنے آپ کو بڑی خریداری

کر کے بڑا ثابت کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے البتہ! بعض لوگوں کی آمدنی وسیع ہوتی ہے جیسے کوئی تاجر ہو یا اس کا ایسا کام ہو جس میں آمدنی کا کمانا بہت آسان ہو ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی بیویاں سوچیں کہ میرا شوہر میری تمام خواہشیں پوری کرے گا۔ لیکن جب کسی کے شوہر کی آمدنی بہت زیادہ ہو اور اس کے پاس رقم فراواں ہو تو کیا اس ساری رقم کو خرچ کر دیا جائے؟ وہ یہ خیال نہیں کر رہی کہ میں نے شوہر کی ساری آمدنی مختلف قسم کے کپڑوں اور مختلف قسم کے دسترخوانوں اور گھریلو ساز و سامان پر خرچ کر دی ہے تو ہمسائے، خویش و اقربا والی اجتماعی مسئولیت جو ہر فرد پر لازم ہوتی ہے اس کا کیا کرے گی؟

بنا برایں میاں بیوی کی دردگیری اور پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورتیں اپنے مالی مسائل میں گھری رہتی ہیں اپنے ذوق، خواہشات، احساسات اپنوں کی رقابت کو مدنظر رکھتی ہیں کہ میری فلاں رشتہ دار کے پاس وہ شے ہے اسے میں کیوں نہ خرید کروں، میری فلاں رشتہ دار کپڑے لے آئی ہے میں کیوں نہ لے آؤں اپنے شوہر کی آمدنی اور لوگوں کی ضروریات کا خیال ہی نہیں کرتیں؟ بیوی کو چاہئے کہ اپنے شوہر کی آمدنی کا خیال رکھتے ہوئے اپنی ضروریات کو پورا کرے اور جو شوہر سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے انہیں بھی کم کرے۔ عورت کو چند چیزوں کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔

شوہر کی آمدنی۔

- دوسرے لوگوں کی ضروریات
- اسلامی اصول جن میں سے ایک بڑا پن اور فضول خرچی سے پرہیز ہے۔

ان سب پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے خاندان کو محبت کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

شوہروں کے بارے میں بھی یہی صورت حال بیان کی جانی چاہئے

آقائی محترم ! آپ کو اپنی بیوی کے جذبات و احساسات اور خاص ذوق کا خیال رکھنا چاہئے۔ بنیادی طور پر اچھا اور خوبصورت لباس عورت کی ضرورت ہے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع' اچھا گھر' صاف ستھرا ماحول' اچھا کھانا' اچھا پینا اس کے لئے ایک مسئلہ ہے اور یہ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ ان چیزوں کا شوہر کو احساس نہیں ہوتا اور ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کونسا رنگ اچھا لگتا ہے اور کونسا رنگ اچھا نہیں لگتا۔ عورت کو ایسے ایسے رنگوں والی چیزیں پسند ہیں ان باتوں سے شوہر عاجز نظر آتے ہیں۔ گلدان کے پھولوں کی سجاوٹ جس طرح عورت کر سکتی ہے ہم اسے محسوس نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہم ان چیزوں کے ساتھ مانوس نہیں ہیں۔ یہ عورتوں کے مسائل ہیں اور وہی بہتر جانتی ہیں کیا ان احساسات کا کوئی جواب ہے؟ کیا ہم خواتین کو کہہ سکتے ہیں کہ ہماری آمدن کم ہے' یا میرے پاس رقم نہیں ہے' یا تم رشتہ داروں کو ملنے نہ جاؤ یا مہمان نوازی نہ کرو یا تحفے تحائف نہ دو؟ دیکھا جائے کہ ہماری بنیادی ضروریات کیا ہیں؟

زندگی کی اصل ضروریات پیٹ بھر کر مناسب کھانا گرمی و سردی سے بچنے کے لئے مناسب لباس اور دوسری چھوٹی موٹی ضروریات زندگی۔

ضروری ہے کہ شوہر دیکھے کہ میری بیوی بھی ایک انسان ہے جو نرمی اور خاص احساس رکھتی ہے' دلبستگی اور مختلف چیزوں کی لذت رکھتی ہے۔

جس طرح شوہر کو چاہئے کہ بیوی کے گھریلو کام کاج کو اہمیت دے اسی طرح اس کے احساسات اور جذبات کا بھی احترام کرے۔ البتہ اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ بیوی کی تمام توقعات کو پورا کیا جائے بلکہ آمدنی کا خیال رکھ کر اعتدال کی رعایت کرتے ہوئے' فضول خرچی و رقابت سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنا چاہئے۔ اگر خواہشات

کے پیچھے دوڑا جائے تو یہ ختم نہ ہونے والی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان خواہشات سے اجتناب کرنا چاہئے البتہ اتنا ضروری ہے کہ شوہر بھی خشک مزاج نہ بن جائے۔

ج۔ دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اعتدال سے پیش آئیں۔

اب پہلے میں خواتین کو مخاطب کرتا ہوں۔

ایک لڑکی نے کسی سے شادی کی شادی کے بعد اس کے خیالات یہ ہیں کہ:

میرے شوہر کے خاندان میں میں اور میرے بچے ہی ہیں اور اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو مورد توجہ ہی قرار نہیں دیتی۔

سو اگر شوہر اپنی کسی بہن کے لئے کوئی چیز خریدنا چاہے یا اپنے کسی بھائی کے لئے تحفہ لینا چاہے یا اپنے والدین کی مالی امداد کرنا چاہے تو بسا اوقات بیوی اپنے شوہر سے بگڑ کر کہتی ہے: تم کو اپنے بچوں اور گھر کی تو کوئی فکر ہی نہیں ہے؟ اب شادی کے بعد تمہارا سب کچھ میں، بچے اور گھر ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ یہ مسائل اکثر خانوادوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور انہیں حسد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی:

عورت اپنے شوہر کو والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ کوئی تعلق رکھے دیکھ نہیں سکتی۔

ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے جس طرح وراثت کے مسائل میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے مال کے وارث ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ شوہر کے ماں باپ بھی وارث ہیں۔ اور اس کے بہن، بھائی، پھوپھیاں، اور چچا، خالہ، ماموں

بھی چند خاص شرائط کے تحت وراثت لیتے ہیں۔

بنا بر ایں شوہر پر اس کے باقی رشتہ داروں کے بھی حقوق ہیں یعنی انسان اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری کے اندر محصور نہ سمجھے۔ اس کی آمدنی میں بیوی بچوں کے علاوہ باقی رشتہ داروں کا بھی حصہ ہے۔ پس بیوی کو چاہئے کہ وہ شوہر کے رشتہ داروں سے وسعت قلبی کے ساتھ ملے اور انہیں مل کر خوش ہو اور اپنے شوہر کو اس کے رشتہ داروں سے مل جل کر رہنے کی تشویق دلائے۔

اب میں اپنے کلام کی طرف حضرات کو متوجہ کرتا ہوں:

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بیوی کے اپنی بہن' خالہ' پھوپھی' بھانجی وغیرہ سے روابط کے سلسلے میں شوہر اکثر تھکاوٹ اور خستگی کا اظہار کرتا ہے۔ جب بیوی اسے تحفہ اور ہدیہ لینے کے لئے اور ان کی دعوت کرنے کے لئے کہتی ہے تو شوہر اسے کہتا ہے کہ تم جب تک اپنے میکے میں تھیں تب تک وہ تمہارے رشتہ دار تھے اب تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے اپنی تمام تر توجہ گھر اور بچوں پر دو!

شوہر کو چاہئے کہ جس طرح اپنے رشتہ داروں کو عزیز رکھتا ہے بیوی کے رشتہ داروں کو بھی عزیز رکھے اور ان سے تعلقات رکھنے کے لئے بیوی کو منع نہ کرے۔

بیوی کو اپنے رشتہ داروں کے گھر جانے کی اجازت دے' ان کی خاطر تواضع کرنے دے اور ان سے لین دین رکھنے دے تاکہ ان کے ساتھ روابط اور صلہ رحمی برقرار رہے۔ اس کے بھائی کو اپنے بھائی کی طرح اور اس کی بہن کو اپنی بہن کی طرح سمجھے اور اس کے باقی رشتہ داروں کو اپنے رشتہ داروں کی طرح قرار دے۔

کم و بیش اجتماعی مطالعات کی بنیاد پر جو ہم نے کئی سال تربیت کے حوالے سے کئے' ہم لوگوں کے گھریلو معاملات میں اختلافات اور لڑائی جھگڑا دیکھتے ہیں یعنی شوہر بیوی

کے رشتہ داروں کو اور بیوی شوہر کے رشتہ داروں کو برداشت نہیں کرتے جس کی وجہ سے ان کی زندگی عذاب بن جاتی ہے

البتہ ! ہم پھر آپ کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے معاملات میں اعتدال سے کام لیں بسا اوقات شوہر اپنے رشتہ داروں میں اس طرح گھل مل کر رہتا ہے کہ اپنے بیوی بچوں کی طرف مناسب توجہ نہیں دیتا اور بسا اوقات بیوی اپنے رشتہ داروں میں اور ان کی خاطر تواضع میں اس طرح سرگرم رہتی ہے کہ اپنے شوہر اور بچوں تک کو فراموش کر بیٹھتی ہے یہ مناسب نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ زندگی کے سفر میں نہ افراط ہو نہ ہی تفریط۔

د ۔ جنسی معاملات

اس مسئلہ کو بہت اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں اور اس کی وضاحت آپ پر چھوڑتا ہوں۔ شوہر اور بیوی کے اختلافات میں سے ایک وجہ معاملات جنسی ہیں۔ اس سلسلے میں دو مطالب بیان کرتا ہوں

شادی کے بعد خواہشیں اور خواب

ایک مرد کسی خاتون کے ساتھ شادی کرتا ہے اور کچھ ہی دنوں کے بعد جب شادی کا جنون ختم ہو جاتا ہے تو وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کی نسبت فلاں بہتر ہے اور فلاں فلاں بہتر تھیں۔ اس کے بعد کف افسوس ملتا ہے اور پشیمانی کا اظہار کرتا ہے کہ فلاں لڑکی کا رشتہ کیوں نہ مانگا؟ ہائے یہ کیا مصیبت ہے جو میرے سر پر آن پڑی

سب سے پہلے ہمارے روابط ایسے لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئیں کہ جن کی وضع ہماری فکر اور معنویت کو بنائے۔ یہ اچھی صلہ رحمی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دین' اخلاق اور تربیت برباد نہ ہو۔

ہے؟ یہ کیسی عورت ہے کہ جس کے ساتھ شادی کر بیٹھا ہوں؟ اسی قسم کی باتیں اپنے لئے ہمیشہ کہتا رہتا ہے۔ وہ خواب اور امیدیں جو شادی سے پہلے وابستہ کئے ہوئے تھا اب ان امیدوں پر پانی پھرتا دیکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایسی کیفیت اختیار کر لیتا ہے کہ اس کے لئے گھر آنا اور بیوی کے ساتھ تعلق مصیبت نظر آتی ہے۔ اور اس کی کسی بات کو بھی برداشت نہیں کر سکتا نتیجتاً بیوی سے محبت' لذت اور صمیمیت بے اثر ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس!

شوہر جیسا بھی ہو عورت شادی کر لیتی ہے۔ جب شادی کے چند روز گزرتے ہیں اور وہ اپنے شوہر کے حالات پر نگاہ کرتی ہے' اس کی معاشرے میں حیثیت کو دیکھتی ہے' اس کے انداز گفتگو کو دیکھتی ہے اور اس کی خاندانی حیثیت کو دیکھتی ہے تو سخت افسوس کرتی ہے۔ اور کہتی ہیں کہ

میری بہن بھی شوہر دار ہے اور میں بھی شوہر دار ہوں۔

میری پھوپھی زاد بہن بھی شوہردار ہے اور میں بھی شوہر دار ہوں۔

کاش فلاں لوگ جو میری خواستگاری کے لئے آ رہے تھے آئے ہوتے۔ اب وہ پرانے خوابوں میں محو ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے شوہروں کا اپنے شوہر کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے جس کے نتیجہ میں اسے گھر زندان لگتا ہے اور وحشت و ناراحتی محسوس ہونے لگتی ہے۔

صریحاً" عرض کرتا ہوں کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے بارے میں جو دیکھنا بھالنا چاہیں شادی سے پہلے کریں۔ ان لڑکیوں اور لڑکوں جنہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی اور ہمسر کے انتخاب پر متوجہ ہیں' کو چاہئے کہ ایک دوسرے کے بارے میں

معلومات حاصل کریں، خوب جانچ پڑتال کریں اور جب کسی کا انتخاب اور تعین ہو جائے اور عقد منعقد ہو جائے تو پہلی تمام باتوں کو بھلا کر دوسری ہزاروں عورتوں سے اپنی بیوی کو بہتر اور دوسرے ہزاروں مردوں میں سے اپنے شوہر کو بہتر جانیں۔ عقد کے بعد بیوی اپنے شوہر کو اور شوہر اپنی بیوی کو سب سے بہتر سمجھے اگرچہ اس سے پہلے ہزاروں عورتیں اور ہزاروں مرد ان سے بہتر تھے۔

اب شوہر اپنی بیوی سے اور بیوی اپنے شوہر سے پیار اور محبت بڑھائے۔

اگر انسان ہوا و ہوس، امیدوں، خواب خیالوں اور تصورات کی دنیا میں رہے تو اسے کبھی بھی آرام نصیب نہ ہوگا۔

جب شادی اور رخصتی ہو جائے تو خوابوں کی دنیا سے باہر آکر ایک دوسرے کے ساتھ کمال محبت اور مہربانی کے ساتھ زندگی کا آغاز کریں۔ اور اس آیت کو ایک دوسرے کے لئے مصداق قرار دیں جس میں ارشاد پروردگار ہے **ھن لباس لکم و انتم لباس لھن"**

وہ بیویاں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان اپنی بیویوں) کے لئے لباس ہو۔

پس ایک دوسرے کو اپنے لئے قلعہ سمجھیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کی حفاظت کریں۔ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے انہی کے لئے ہے۔ یہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے ہی ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی جان سمجھیں اور دوسروں کو بھلا دیں۔ یہ باہمی محبت اور شادی کے بندھن کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے۔

جماع کا رابطہ

ہمارے موضوع میں دوسرا مطلب جسے مختصراً" بیان کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ

بیوی کو چاہئے کہ مرد کی جنسی خواہش پوری کرے"

یہاں فزکس کی بحث نہیں ہے کہ کیا مرد اور عورت میں جنسی خواہش مساوی ہوتی ہے یا کسی میں زیادہ؟ عورتوں کو جان لینا چاہیے کہ اگر آپ چاہتی ہیں کہ شادی کا بندھن محفوظ رہے تو جنسی اعتبار سے شوہر کو راضی رکھیں۔ یہ اس لئے ہے کہ نبی اکرم صلوات اللہ علیہ اور ائمہ اطہار علیہم السلام نے فرمایا ہے کہ:

عورت کو چاہئے کہ اپنے شوہر کے لئے اپنے آپ کو سجائے اور زینت دے۔ محبت و پیار اور خوشی کے ساتھ پیش آئے۔

ایک جملہ جس کی مردوں کو نصیحت کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ عورت محبت چاہتی ہے۔ آپ اسے احساس دلائیں کہ اس کا شوہر اس سے محبت کرتا ہے۔

یہ مسلمہ بات ہے کہ عورت محبت کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہے یعنی جس طرح مرد جنسی خواہشات زیادہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اسے اس سلسلہ میں راضی رکھے۔ اسی طرح عورت بھی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر اس سے محبت کرے۔ اگر اسے احساس ہو کہ اس کا شوہر اسے پسند کرتا ہے اور اچھا سمجھتا ہے تو وہ سکون اور آرام محسوس کرتی ہے اور خوش و خرم رہتی ہے روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ بیویوں سے زبان کے ذریعے دوستی اور محبت کا اظہار کریں۔ اس قسم کی چیزوں کا مظاہرہ کوئی مانع نہیں رکھتا اور یہ اظہار ریاکاری بھی شمار نہیں ہوتا۔ یہ خیال نہ کریں کہ میں تو بیوی کو دل و جان سے چاہتا ہوں زبان سے اقرار ضروری نہیں ہے یا زبانی اقرار کیوں کروں؟ اگر کبھی مسافرت پر جاؤ تو اس کی طرف اپنی خیریت کا خط لکھو۔ بیوی سے قولاً" اور فعلاً" محبت کو ظاہر کرو اور کبھی کبھار اسے تحفہ بھی لا کر دو بیوی کو اگرچہ چھوٹا سا ہی تحفہ دیا جائے اس سے محبت میں اضافہ ہے۔ بنا برایں بیوی کے

بارے میں سوچنا شوہر کے وظائف میں شامل ہے اور اس سے باہمی محبت، تعلق اور ارادت بڑھتی ہے۔

ھ۔ ایک دوسرے کی دینی اور اجتماعی مسئولیت کو اہمیت دینا

اس سلسلے میں ذرا گھر کے ماحول سے باہر قدم نکالتے ہیں اور خدا و مخلوق خدا کی بابت بحث کرتے ہیں۔ ابتدا میں عورتوں سے خطاب کرتے ہیں:

آپ کے شوہر کا آپ اور آپ کے بچوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق اور معاشرہ کے ساتھ بھی تعلق ہے۔ آپ اپنے شوہروں کو اجازت دیں کہ وہ معاشرہ کی اصلاح احوال اور مذہب کی خدمت کے لئے بھی وقت صرف کریں۔

اگر کبھی رات کو شوہر دیر سے گھر آئے تو اس سے کسی قسم کا تکرار نہ کرو کیونکہ وہ کسی اجتماعی کام میں یا کسی مذہبی کام کے سلسلہ میں پھنسا ہوا تھا، بلکہ اسے اجازت دو کہ کچھ دیر امور خیریہ میں صرف کرے۔ اسے زور دے کر کہیں اور آمادہ کریں بلکہ اس کے ساتھ محاکمہ کریں!

شوہر عزیز من!

آپ نے اس ہفتہ میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور انسانیت کے لئے کیا کام کیا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کے لئے کیا کام کیا ہے؟ کیا آپ کی یہی ذمہ داری ہے کہ کچھ دیر کام کریں، اس کے عوض میں تنخواہ لے آئیں اور اسے بال بچوں پر خرچ کردیں یا بنک بیلنس بڑھائیں یا ایک گھر سے دوسرا گھر خریدتے پھریں؟ یہی اور بس؟ بیوی ہی شوہر کے مذہبیات میں وقت دینے کے لئے موثر کردار ادا کر سکتی ہے اور مذہبیات میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔

اگر شوہر کچھ رقم نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا چاہے، دینی کاموں میں کچھ وقت دینا چاہے ادھر بیوی ان کاموں پر خوش نہ ہو اور کہے آپ کو اپنے گھر اور بچوں کی فکر نہیں ہے ہمیشہ اپنا وقت اور پیسہ دوسروں پر خرچ کرتے رہتے ہیں تو یہی اعتراض اور شوہر کی سرزنش گھر میں ناراحتی اور ناچاقی کا باعث بن سکتی ہے۔ یہی عورت شوہر کو نیکی کے کاموں میں سرمایہ صرف کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے اور یہی عورت بہت بڑی رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔

اسی طرح مرد حضرات کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اپنی بیویوں سے فقط یہ توقع نہ رکھیں کہ انہیں گھر کا ساز و سازمان دے دیا ہے اور بس وہ گھریلو کام کاج میں لگی رہیں بلکہ انہیں بھی مذہبیات میں مطالعہ اور فعالیت کرنے کی اجازت دیں۔ اور انہیں جلسوں اور مذہبی کلاسوں اور محافل میں جانے دیں۔ اس لئے کہ ان پروگراموں میں شرکت ان کے لئے مفید اور بہتر ہے انہیں تھوڑا سا وقت دینی معلوماتی پروگراموں کے لئے بھی دیں تاکہ ان کی فکر اور دینی معلومات میں اضافہ ہو۔

انہیں بے چارہ اور معاشرہ کے خستہ حال لوگوں کے لئے بھی وقت دیں تاکہ ان کاموں میں بھی ان کا حصہ ہو۔ صرف اجازت ہی کافی نہیں ہے بلکہ اگر وہ ان مراسم میں شرکت نہیں کرتیں تو ان کے ساتھ بحث و تکرار اور محاکمہ کریں اور جب ایک ہفتہ ختم ہو تو اپنی بیوی سے پوچھیں!

بیگم صاحبہ!

گزشتہ ہفتہ میں آپ نے خدا کے لئے کیا کام کیا ہے؟ کتنا مطالعہ کیا ہے کہ جس سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوا ہو؟ کس قدر اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اپنے معاشرہ کی خدمت کی ہے؟

پہلی فصل میں محاکمہ کی بحث کا ذکر نہیں کیا لیکن اب اس کی بابت ذکر کرتے ہیں اس میں اہداف اسلامی، مذہبی اور روحانی کا معاملہ ہے اور وہ معاملہ جو خدا، خلق خدا اور اجتماع کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں شوہر اپنی بیویوں کا اور بیویاں اپنے شوہروں کا مواخذہ اور باز پرس کریں۔

ممکن ہے کہ یہ سوال اٹھایا جائے کہ کیا بہتر نہیں ہے کہ انسان خدا اور مخفی امور خیریہ کی خدمت انجام دے۔ اس محاکمہ میں یہی معاملات واضح کیۓ گئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان الذین یتلون کتاب اللّٰہ و اقاموا الصلٰوۃ و انفقوا مما رزقنا ھم سر او علانیۃ یرجون تجارۃ لن تبورا۔" سورہ فاطر/۲۹

تحقیق جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علی الاعلان، خرچ کرتے ہیں تو یہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو زوال پذیر اور ضائع ہونے والی نہیں ۔ ،۔ یعنی:

ریاکاری سے بچنے کے لئے اور اپنی تربیت کی خاطر انسان پوشیدہ کام سرانجام دے تو یہ بہت اچھا کام ہے لیکن دوسری طرف بسا اوقات انسان کے لئے علی الاعلان نیک کاموں کا بجا لانا پسند کیا جاتا ہے۔ جب آپ نیکی کو علانیہ بجا لائیں گے تو اس سے دوسروں کو بھی شوق پیدا ہوگا اور وہ تربیتی اثرات سے فیضیاب ہوں گے۔ اور ان کا یہ عمل ایک قسم کا شعار کہلائے گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ شوہر جو جو نیکی کا کام کرے یا نیکی کی راہ میں سرمایہ خرچ کرے وہ اسے اپنی بیوی کے سامنے بیان کرے۔ یا اگر کسی کی بیوی کوئی مذہبی خدمات سرانجام دے تو انہیں اپنے شوہر کے سامنے بیان کرے۔

جس طرح نماز کے بارے میں حکم ہے کہ نماز کا کچھ حصہ باآواز بلند اور کچھ حصہ آہستہ پڑھا جائے۔ نماز کا بلند آواز سے پڑھنا اس لئے ہے وہ سننا اس کے اپنے نفس کی تلقین کا باعث بنے۔ نیز بلند آواز سے پڑھنا مذہبی شعار اور موثر اقدام ہے۔ اسی طرح نماز کا آہستہ پڑھنا بھی خود سازی ہے۔ باقی اجتماعی خدمات بھی اسی ترتیب سے ہونا چاہئیں۔ جس شے کو اسلام پسند نہیں کرتا وہ ریاکاری اور دکھاوا ہے ورنہ بہتر ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کے کاموں سے باخبر رہیں اور خود میں عمل خیر کی امنگ پیدا کریں۔

جب کوئی انسان دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ نیک کام کر رہے ہیں تو وہ اس سے خوشی محسوس کرتا ہے اور اس کے اندر بھی ایسے کام کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ دوسروں کے کاموں سے بے خبر ہے تو مایوس' ناامید اور ناراحت رہے گا۔ بنا برایں ضروری ہے کہ انسان کبھی چھپ کر اور کبھی علانیہ کام سرانجام دے۔

میری بات یہاں ختم ہوتی ہے اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے ان مسائل کا تعلق ان اصولوں کے ساتھ ہے کہ اگر ان پر توجہ دی جائے تو شاید ایک مناسب ماحول اور اجتماعی کوشش وجود میں آئے جو بچوں کی پیشرفت' پرورش اور رشد میں مؤثر ہو۔

ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ اپنے وظائف سے آگاہ ہوں اور اسلام کے عالی احکامات پر عمل پیرا ہوں اور کوشش کریں کہ حقیقی مسلمان بن جائیں تاکہ اپنے خاندان' اولاد اور معاشرہ کے لئے مفید اور سازندہ قرار پائیں اور دنیا و آخرت کی سعادت پائیں۔

ضمیمۂ فرزندان و اولیا

(اولاد اور متعلقین کی تربیت میں بنیادی اور اساسی شے)

ارشاد پروردگار ہے:

"فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک------" (سورہ آل عمران آیت ۱۵۹)

"(اے رسول یہ بھی) خدا کی ایک مہربانی ہے کہ تم (سا) نرم دل (سردار) ان کو ملا اور تم اگر بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے گرد سے (کب کے) تتر بتر ہو گئے ہوتے"

ہماری بحث کا موضوع اولاد اور اولیا کی تربیت میں بنیادی اور اساسی شئے ہے یعنی ان کی تربیت میں جس شے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس بحث میں وارد ہونے سے پہلے جو مقدمہ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے:

گزشتہ سال دوران درس و تدریس سوال و جواب کی شکل میں نوٹس تیار کر کے دوستوں کے درمیان تقسیم کئے گئے۔ اور اس میں ایک بات کو مدنظر رکھا گیا تھا وہ یہ کہ "بچے کی عادات' روحیات اور بچپنے کے مختلف پہلو"۔ انہیں ان کے موارد میں مورد بحث قرار دیں گے۔

تقریباً" پانچ سو افرد کی طرف سے سوال موصول ہوئے۔ ان سوالات کے جو جوابات دیئے گئے ---- وہ بہت جالب تھے (ہمیشہ شخصی اور خصوصی گفتگو میں شمار اور حساب زیادہ مناسب ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ دوستوں میں سے دو یا تین شخص درسی اور اخلاقی اعتبار سے بچوں کی پیشرفت کے بارے میں گفتگو کریں۔ اگر انسان کچھ دیر کے لئے اپنے ذہن میں مدرسہ کی تصویر کو لائے اور تصور کرے کہ وہ اب مدرسہ میں ہے۔ یا اس کے برعکس کوئی پڑھائی میں کمزور دانش آموز (طالب علم) --- اپنے پڑوسی یا کسی رشتہ دار سے کہے کہ میں نے فلاں مدرسہ میں داخلہ لیا تھا اور درسی حوالے سے پیشرفت نہ کر سکا۔ جو لوگ

ان کے بعد بھی سوالات کو منظم اور شمار کیا گیا اور ان سوالات کے شمار کے مطابق فیصلہ اور قضاوت بہت زیادہ اطمینان کا باعث ہے[۱]

پہلے قدم کے طور پر ---- تین سوالوں کو منظم کرکے تقسیم کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ بہت زیادہ اہم اور حساس ہے۔ سوچا گیا ہے کہ آج کے اس جلسہ میں اسی موضوع پر بحث کی جائے وہ سوال یہ ہیں۔

پہلا سوال :۔ ایک بچے کے اپنے رشتہ داروں اور خصوصاً ماں باپ کے ساتھ تربیت کے اصول کا میزان کیا ہے؟ یعنی وہ انہیں اپنا دوست سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ مانوس ہے یا ان کے ساتھ بیگانوں کی طرح کنارہ کش، نفرت، دشمنی رکھتا ہے۔

دوسرا سوال :۔ اس کی گھر میں گھر والوں کے ساتھ ہم کاری کا میزان کیا ہے؟ کیا وہ

مدرسہ کی وضع سے آشنا نہیں ہیں، وہ اس کی وضع کے سننے کے ساتھ، مدرسہ کے بارے میں کلی طور پر اپنی نظر قائم کریں ---- یہ ان مسائل کے متلعق ہے جو قابل افسوس ہیں کہ ہم اجتماعی امور میں شاذو نادر موارد کے ذریعے سے قضاوت کریں۔

ایک شے جو کسی مدرسہ کے بارے میں سنی جائے تو اسے اس مؤسسہ اور ادارہ میں عمومی سطح پر قرار دیں لیکن شمار اور تنظیم ایسے نہیں ہوتے۔ یہ بہت سے مختلف خاندانوں کے نظریات کا مجموعہ ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ سوالات دقت کے ساتھ صحیح طور پر ہوئے ہیں یا نہیں ---- ایک دوسرا مسئلہ ہے لیکن پہلی محدود قضاوت سے صحیح تر ہے۔

(اسی گذشتہ سال سے سوچا گیا تھا کہ اگر

ان مسائل کو حل کیا جائے تو کتنا اچھا ہے یعنی کوئی تربیتی جلسہ تشکیل دیا جائے یا دوستوں کے ساتھ گفتگو کی جائے تاکہ ان میں جو کمی اور نقص ہے اس سے انہیں آگاہ کیا جائے جس سے وہ اپنی کمزوری اور نقص کو دور کریں۔ اس کام نے موجودہ سال میں "انجمن خانہ و مدرسہ" کی تشکیل کے ساتھ ایسی صورت پیدا کرلی ہے اور اس سلسلہ میں فضلا کے ایک گروہ کو مامور کیا گیا ہے۔ اور انہوں نے اس بارے میں بہت زیادہ کوشش کی ہے)

گھر والوں کا گھریلو کام کاج میں ہاتھ بٹاتا ہے یا نہیں؟

تیسرا سوال:۔ ماں باپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کس حد تک ہے اس کا میزان کیا ہے؟ کیا وہ والدین کے حکم اور بات کی پروا کرتے ہوئے اس کے مطابق عمل کرتا ہے یا نہیں؟

یہ تینوں سوال باہم مربوط تھے اور مجموعی طور پر ان کے جوابات میں سے بیس فیصد مثبت اور باقی منفی' متوسط یا ضعیف تھے یعنی اسی فیصد جواب یہ تھے کہ بچوں کی صمیمت ضعیف ہے۔ وہ کچھ ہمکاری کرتے ہیں اور کم موارد میں والدین کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ بات سبب بنی کہ ان سوالات کی بابت بحث کی جائے تاکہ لوگوں میں موجود کمی کو پورا کیا جاسکے۔

بحث میں وارد ہونے سے پہلے ایک اور مقدمہ عرض کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہماری اس بحث کا نتیجہ والدین اور اولاد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے ہم سب پسند کرتے ہیں کہ ہمارے مراسم اپنے قریبیوں کے ساتھ ایسے ہی ہوں اور یہ کہ وہ لوگ ہمارے وفادار اور سچے دوست رہیں' ہمارے ساتھ ہمکاری کریں اور ہماری باتوں کو اور ہماری نصیحتوں کو اہمیت دیں۔

بنا برایں ----- ہم اس بحث کے نتیجہ کو عمومیت دے سکتے ہیں یعنی گھر کے علاوہ باہر کے معاملات میں بھی اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے

نسلوں کا فرہنگی اختلاف

تیسرا مسئلہ کہ جسے مختصراً" ذکر کرنا ہے یہ ہے:

تاریخ انسانیت میں ایک شے نظر آتی ہے ---- وہ یہ کہ شاید بچوں کے ماں باپ کے ساتھ اچھے تعلقات نہ ہونے کی اصل وجہ وہ تفاوت ہے جو نسلوں کے درمیان موجود ہوتا ہے۔

یعنی:

ایک نسل ختم ہوتی ہے تو نئی نسل معرض وجود میں آتی ہے اور یہ نئی پود ماں باپ کی اہمیت، ادب و احترام، مسائل، عادات، جہان بینی، طرز تفکر اور پہلی نسل کے خواص کی طرح وفادار نہیں ہوتی اور وہ پہلے لوگ جو عزت و احترام اور اہمیت کی نگاہ سے بزرگوں کو دیکھتے تھے یہ نئی پود ان کی اس روش میں تردد کا شکار رہتی ہے۔ اب ان کے سامنے نئے مسائل اور ان کے نئے تقاضے ہوتے ہیں۔ لٰہذا ان خانوادوں کے افراد کے درمیان دو قسم کی تاریخ رقم ہوتی ہے پہلے والے لوگوں کی اور نئی نسل کی۔ ان دونوں کے درمیان تیس، چالیس سال کا فاصلہ ہوتا ہے۔

آپ توقع اور امید نہ رکھیں کہ پچاس سالہ باپ اور بیس سالہ بیٹے کی سوچ ایک جیسی ہوگی۔ البتہ بہت تیزی کے ساتھ تاریخ اپنے صفحات اس ہستی سے الٹا رہی ہے۔ ان دونوں فکروں کے درمیان فاصلہ بھی زیادہ ہو رہا ہے۔

یعنی!

آج سے ایک سو پچاس سال قبل جو شے ہمارے بزرگوں کے ذہنوں میں تھی اور پر دادا اور دادا کے درمیان فکر کے اعتبار سے اور آداب و عادات کے اعتبار سے فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ جب وہ کسی مجلس یا زیارت کے لئے جاتے تھے تو ان کے لباس اور کھانے کے انداز میں بہت کم فرق ملاحظہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اب ہمارے دور میں تاریخ اور وقت بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

اگر بلندی سے کوئی پتھر نیچے گرے تو وہ بہت تیزی کے ساتھ نیچے کو آتا ہے۔ اسی طرح تاریخ جہاں اور عموماً" بعض ملتوں کی تاریخ علمی، فکری، آداب و عادات کے اعتبار سے بہت آگے نکل چکی ہے اور دن بہ دن اس کی تیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ایک روایت مولا علی علیہ السلام کی طرف منسوب ہے جس میں آپؑ نے فرمایا: اپنی اولاد پر ان کے زمانے کے تقاضوں کے مطابق بوجھ ڈالیں کیونکہ وہ آپ کے زمانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے زمانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ شاید یہ روایت ہمارے مدعا کی موید قرار پائے کیونکہ ہر نیا زمانہ کئی مسائل کو اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اولاد اور بزرگوں کی فکر میں یکسانیت ہوسکتی ہے۔

ایک بات آپ کو یاد دلاتا ہوں وہ یہ کہ ممکن ہے کہ ہمارے چھوٹے بچے ان مسائل اور حالات سے دوچار نہ ہوں لیکن اگر ہم اور وہ زندہ رہے تو مستقبل میں پتہ چل جائے گا کہ ہمارے حالات اور مسائل اور ان کے مسائل اور حالات میں کس قدر تفاوت ہے۔

بچوں اور بڑوں کے درمیان فرق ------ گزشتہ اور نئی نسل کے درمیان تفاوت، ممکن ہے کبھی مثبت ہو اور کبھی منفی۔ کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ بیٹا بدکردار ہوتا ہے اور فسادات کرتا ہے جو نیک اور صالح باپ کے ساتھ

(یہاں کسی خاص قوم یا قبیلے کو مدنظر نہیں رکھا گیا بلکہ مجموعی طور پر تاریخ اپنے ہر دور میں ترقی کے زینے پر ہے۔ اور کمال و رشد کو حاصل کرتی ہے۔ اور اس کی سرعت اور تیزی میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے۔)

سازگار نہیں رہتا۔ اور کبھی کبھی باپ بد کردار ہوتا ہے اور بیٹا نیک و صالح ہوتا ہے اب یہاں باپ بیٹے کی فکر میں انس و محبت نہیں ہوگی۔ اور وہ ایک دوسرے کے خلاف سوچ رکھتے ہوں گے۔ اور ممکن ہے کہ ایسا اختلاف اور تفاوت دوسرے بہت مسائل اور جہات کو بھی جنم دے۔ بہرحال گزشتہ نسل اور جدید نسل کی فکر میں بہت زیادہ فاصلہ ہے اب مقدمات سے فارغ ہونے کے بعد اصل بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اصول صمیمیت

اولاً" دیکھنا یہ ہے کہ صمیمیت سے کیا مراد ہے اور اس کے آثار کیا ہیں؟ ہم جو چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست اور اولاد صمیمیت رکھتے ہوں تو پھر وہ کیسے ہونے چاہئیں؟ وہ ہمارے مقابلے میں کیسے ہونے چاہئیں کہ ہم کہہ سکیں کہ یہ صمیمی ہیں؟

ان سوالوں کا جواب تین اصولوں میں مل سکتا ہے اور یہی صمیمیت کے اصول ہیں۔

پہلی اصل :۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا محرم راز اور مشیر قرار دے یعنی انسان اس کی نسبت اس طرح ہو کہ اپنے راز اور مشورے اس سے کرے اور اسے اپنا وفادار محسوس کرے۔ اور سمجھے کہ یہ میرا راز فاش نہیں کرے گا بنا براین' صمیمیت کے آثار اور شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ :

کوئی شخص انسان کا محرم راز اور مشیر ہو۔

دوسری اصل :۔ کوئی شخص اپنی خواہشات دوسرے کے سامنے بیان کرے کہ وہ اس کی توقع پر پورا اترے گا۔ اساساً" آپ ہر کام کے لئے دوسرے شخص کی طرف رجوع

کرتے ہیں ---- بعض لوگ اس مسئلہ کو یوں تعبیر کرتے ہیں "وہ تو کسی کے پاس کام کے لئے نہیں جاتا" اس لئے کہ یہ ایسا شخص ہے جو قولاً" و فعلاً" آپ کی مدد کرتا ہے۔

"آپ کا صمیمی دوست وہ ہے جسے آپ اپنا اچھا ہمکار اور اچھا مددگار محسوس کریں"

تیسری اصل :- دو افراد کے مابین گہری دوستی اس طرز پر ہوتی ہے کہ وہ اس قابل ہو اور ان میں جرات ہو کہ ایک دوسرے کی خطائیں ایک دوسرے کے سامنے رکھ سکیں۔ افراد کے مابین اور ان معاشروں کے مابین جو غیر ترقی یافتہ ہوں ان میں کمزوریوں اور نقاط ظرف کو دیکھنے کی عادت بہت پختہ ہوتی ہے۔ یعنی ایک شخص اس بات کے درپے ہوتا ہے کہ دوسرے کی کمزوریوں کو دریافت کرے اور انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرے یہاں تک کہ بڑے پرانے دوستوں سے بھی وہ فرد قطع تعلق کرلیتا ہے۔ جن کے بارے میں انہیں کوئی شبہہ ہو جائے یا جن کی لغزش ان کی نگاہ میں آئے۔ یا پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اس کی لغزشوں اور خطاؤں کی بنا پر اپنے لب سی لے حالانکہ کئی سال تک اس نے اپنے اس دوست سے اچھائیاں ہی دیکھی ہوتی ہیں۔

یا پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص آپ کے کسی فرزند کی کارکردگی آپ کے سامنے رکھے وہ معمولی نظر آتی ہے۔ اور اسے ظاہر کرنے کے لئے آپ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ حالانکہ آپ اس کی اچھائیوں پر نگاہ نہیں ڈالتے کیا سبب ہے کہ آنکھ میں کمزوریوں کو دیکھنے کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ جبکہ اجتماعی تعلقات کی سطح پر دوستوں اور ساتھیوں کی سطح پر ہمسایوں کے ساتھ اور ان سے خاندانی تعلقات کے حوالے سے یہ طاقت کمزور ہوتی ہے۔ خصوصاً" رائج افواہوں کے مسئلے میں یہ ایک مصیبت بن جاتی

ہے کسی شخص کو یا کسی گروہ کو ایک معمولی سی افواہ کی بنیاد پر جو اس کے بارے میں رائج ہو جائے اسے گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ افواہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک ایک زبان سے دوسری زبان تک بغیر کسی تحقیق اور سوچ بچار کے منتشر ہوتی جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ اس افواہ کا رواج پا جاتا اور اس کی بنیاد پر کسی فرد کو خوار کرنا اس کی آبرو ریزی اور اس کی حیثیت کو کم کرنا اس گمان کی بنا پر ثواب رکھتا ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نیک کام ہے یہ صفات اس قوم کی ہیں جو ترقی یافتہ نہیں۔

اگر انسان کسی کو اس قدر اپنے نزدیک سمجھے کہ اپنی کمزوریاں اس کے سامنے بیان کر سکے۔ تو یہی صمیمیت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے۔ دوست سے کہے کہ مجھ میں فلاں عیب ہے۔ اسے دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ مجھ سے فلاں غلطی ہو گئی ہے جس سے میری عزت اور آبرو خطرے میں ہے اس کا کیا حل ہے؟ اور یہ سب کچھ بتاتے وقت وہ یقین رکھتا ہے کہ میرا دوست اس کا تذکرہ کسی کے سامنے نہیں کرے گا۔ اور حتی الوسع اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ بنا برایں ---- صمیمیت کی علامات میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کو دوسرے کے سامنے بیان کر سکے اپنا درد دل بیان کرے اور اس سے مدد اور ہمکاری کی توقع رکھے

یہ سب صمیمیت کی علامات ہیں ------ اگر آپ کے دوست زیادہ ہوں اور آپ کسی دن اپنے رشتہ داروں، دوستوں، پڑوسیوں ---- کو شمار کریں جو بہت زیادہ بنیں تو یہ سب صمیمی (پکے) دوست نہ ہوں گے بلکہ ان میں سے کچھ لوگ محرم راز اور پکے دوست ہوں گے! اور یہ دوست انگلیوں پر گنے جا سکیں گے۔ امید ہے کہ ہمارا مطلب پوری طرح ذہن نشین ہو گیا ہو گا۔

گھر میں صمیمیت قائم کرنے کے ذرائع

ایسا کام کیا جائے ---- کہ بچے گھر میں صمیمیت سے آشنا ہو سکیں اور اپنا درد

دل والدین کے سامنے بیان کر سکیں۔ اور اگر انہیں کسی شے کی ضرورت ہو تو والدین سے طلب کریں۔

سننے میں آیا ہے کہ کبھی کبھار کہا جاتا ہے کہ فلاں باپ اپنے جوان بیٹے کا دوست لگتا ہے وہ کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے رہتے ہیں ---- جوان بیٹا باپ کے ساتھ سفر کرتا ہے اور اس سے اپنا درد دل کہتا ہے کیا آپ بھی ایسا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یا صرف سلام علیک اور کیا حال ہے ٹھیک ٹھاک ہوں--- ہی پر گزارا کرنا چاہتے ہیں؟

والدین اور اولاد کے درمیان فاصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ بات تک نہیں ہوتی۔ اسی جوان بیٹے کو اگر کوئی دوست مل جائے تو دو دو گھنٹے گپیں ہانکتے رہتے ہیں لیکن ماں، باپ کے ساتھ بات تک نہیں ہوتی۔ کیا ان کی روحیں اور دل ایک دوسرے کے نزدیک نہیں ہیں یا وہ ایک دوسرے کے ساتھ مہربانیاں نہیں کرتے؟

آخر الامر ---- ان والدین کی بچوں کے ساتھ اور بچوں کی والدین کے ساتھ صمیمیت نہیں ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ گھر میں صمیمیت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟

اس بارے میں دس اصول بیان ہوئے ہیں جنہیں میں مختصراً بیان کرتا ہوں۔

اول: ماں باپ کے درمیان صمیمیت

اگر ہم چاہیں کہ ہماری اولاد ہمارے ساتھ صمیمیت رکھتی ہو اور ہمارے ساتھ ہمکاری اور ہماری فرمانبرداری کرے ---- تو ضروری ہے کہ ہم سوچیں کہ ہمارے (ماں باپ کے) درمیان صمیمیت ہے یا نہیں ہے؟ یعنی کیا ماں باپ آپس میں دوست

ہیں ------؟ کیا بڑے بہن بھائی ایک دوسرے کے ساتھ یا والدین کے ساتھ صمیمیت رکھتے ہیں؟ یہ ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کہ انسان حکم دے اور دوسروں سے اطاعت کی توقع رکھے لیکن وہ اس کے حکم سے روگردانی کرتے ہوئے عمل نہ کریں۔

"کونو ادعاۃ الناس بغیر السنتکم"

لوگوں کو نہ صرف زبان سے بلکہ اپنے عمل سے نیکی کی دعوت دو۔

آپ کا عمل مامور بہ کی جہت' راہ چاہت کو ظاہر کرتا ہے ہم بہت سے شوہروں اور بیویوں کو دیکھ چکے ہیں ---- جو ایک دوسرے سے گھریلو معاملات اور ضروریات زندگی کے علاوہ کسی قسم کی بات تک نہیں کرتے۔

ایسے نہیں ہے کہ وہ مل بیٹھ کر کسی اجتماعی' فکری یا دینی مسئلہ کے بارے میں بحث و مباحثہ کریں یہی خاتون رخصت کے موقع پر ------- شوہر کو خدا حافظ اور التماس دعا کہتی ہے۔ ایک گھنٹہ دوسری عورتوں کے ساتھ تو باتیں کرتی رہتی ہے مگر جب اپنے شوہر کے پاس بیٹھتی ہے تو ایسے چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے گویا اس کے پاس کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔

کم از کم روزانہ آدھا گھنٹہ میاں بیوی آپس میں گفتگو کریں اور اس دوران روز مرہ کی باتیں' جھاڑو اور باقی گھریلو جنجال کے بارے میں باتیں نہ ہوں بلکہ با مقصد اور با نتیجہ گفتگو کریں۔

اگر گھر کے اندر ماں باپ کے درمیان صمیمیت ہوگی تو توقع کی جاسکتی ہے کہ کل اولاد بھی ان کے ساتھ ہمکاری کرے گی اور ان کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹائے گی۔ اگر میاں بیوی ایک دوسرے کی بات اور نظر کا احترام کریں گے تو پھر بچوں سے بھی فرمانبرداری کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ان تکلیف دہ باتوں کو ختم کیا جائے۔ پس اس کا اولین حل یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے میں صمیمیت پیدا کریں' ایک دوسرے سے محبت و دوستی سے پیش آئیں اور ایک دوسرے کے سامنے اپنا درد دل بیان کریں۔ تاکہ گھر کی چار دیواری کے اندر اچھی صفات پرورش پائیں۔

دوم: ہوشیاری' دقت اور حسابگری

صمیمیت اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ اولاد اپنے والدین کو ہوشیار اور مشکل کشا محسوس کریں۔ کبھی کبھی بچوں کے ہاتھوں میں والدین کی کمزوری آجاتی ہے جس سے ممکن ہے کہ بچہ محسوس کرے کہ میرا باپ نادان اور کم عقل ہے جسے فریب دیا جا سکتا ہے یا کہے کہ والد صاحب سے غلطی سرزد ہوئی ہے یا..... وہ کوئی جھوٹ بولے گا تو والد اس کی بات کو قبول کرلے گا یا کوئی کام خلاف قانون اور خلاف ضابطہ کرے گا تو باپ پروا نہیں کرے گا۔

بنا برایں بچے میں احساس پیدا ہو گا کہ میرا باپ کوئی مستقل مزاج آدمی نہیں ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ان مشکلات کی وجہ باپ کا کم تعلیم یافتہ ہونا یا اس کی معاشرتی حیثیت کا نہ ہونا ہے اس لئے کہ کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ باپ کم تعلیم یافتہ ہوتا ہے یا بالکل ہی ان پڑھ ہوتا ہے لیکن وہ بہت زیادہ تیز اور ہوش و حواس والا شخص ہوتا ہے۔

کبھی کوئی شخص معاشرے میں اس طرح موقعیت اور شخصیت کا مالک ہوتا ہے کہ وہ مورد اعتماد نہیں ہو سکتا۔ بے شک وہ اخلاقی قدروں کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو

کیونکہ جو شخص ناداں اور سیدھا سادا ہو وہ مستقل مدقق شخص نہیں بن سکتا۔ اور ایک معروف قول کے مطابق انہوں نے اس کا خط پڑھ لیا ہے" (یعنی اس کی عادات سے واقف ہوچکے ہیں)۔

اگر بچے سمجھیں کہ ہم اپنے والدین کو دھوکا دے سکتے ہیں تو اس گھر سے صمیمیت کا جنازہ اٹھ جائے گا۔ اور ہر کوئی اپنا مقام بنائے گا اور اپنا اپنا کام کرے گا۔

سوم: اخلاق اور تربیت کی حامل شخصیت

ضروری ہے کہ اولاد کے دل میں والدین کی ایسی شخصیت ہو کہ وہ سمجھیں کہ ہمارے والدین مجسمہ اخلاق اور تربیت یافتہ شخصیت کے حامل ہیں۔

یعنی جانتے ہوں کہ ------ ہمارا باپ جب بولتا ہے تو سچ بولتا ہے' جب وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا کرتا ہے' انصاف کرتا ہے تو عدل کرتا ہے۔ بلکہ جب بھی کوئی کام کرتا ہے تو صحیح کرتا ہے۔ میری ماں پاکدامن ہے درستکاری' پاکی' صداقت اور حسن خلق والی ہے یہ سب چیزیں انسان کی شخصیت کو بڑھاتی ہیں۔

جب کسی شخص کی شخصیت مسلم ہو جائے تو دوسرے لوگ بھی اپنے مقابل میں اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔

چہارم: بچوں کی غلطی پر مناسب رویہ اختیار کرنا

اگر ماں باپ ایسی عادت بنا لیں ----- کہ ادھر بچے سے ذرا سی خطا سرزد ہوئی ادھر مار کٹائی شروع!

اس سے بچوں کی عادتیں بگڑ جاتی ہیں اور بچے زیادہ غلطیاں کرنا شروع کر دیتے ہیں مثلاً"

کھانا کھاتے وقت پلیٹ کو الٹ دیتے ہیں، یا برتن توڑ ڈالتے ہیں، چلتے پھرتے فرش کو گندہ کر دیتے ہیں، دیواروں پر لکیریں ڈال دیتے ہیں، اپنے سے چھوٹوں کی مار پیٹ کرتے ہیں، کپڑوں کو جلدی گندہ کر دیتے ہیں۔ بچوں کی زندگی میں بہت زیادہ غلطیاں رونما ہوتی ہیں۔

بعض والدین جب بچے سے چھوٹی سی غلطی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہاتھ اٹھا کر اس کے منہ پر یا سر پر دے مارتے ہیں۔ اور اس سے گالی گلوچ کرتے ہیں اور اگر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے تو آہستہ آہستہ والدین اور بچوں کے درمیان سے صمیمیت ختم ہو جاتی ہے۔ والدین جس قدر غصہ کا اظہار کرتے ہیں بچہ ڈھیٹ مزاج بن جاتا ہے اور یہ غصہ شخصیت اور حسابگری کا مخالف ہے۔

اس کے برعکس بعض والدین ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بچے کچھ بھی کرتے رہیں انہیں نہیں ٹوکتے۔ بچے شور مچاتے ہیں، چھوٹوں کو اذیت دیتے ہیں، کبھی اوپر جاتے ہیں اور کبھی نیچے آتے ہیں، گھر اور لباس کو کثیف کرتے ہیں ---- لیکن پھر بھی ان کے والدین ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ "بچوں کی مارپیٹ اور بے پروائی سے بے پرواہی" دونوں طریقے غلط ہیں۔

یہی شور شرابے کی صورت حال کلاس میں بھی پائی جاتی ہے ----- ممکن ہے کہ استاد غصے میں آکر مارنا شروع کر دے حالانکہ شاگرد کی غلطی سے استاد کو جذبات میں نہیں آنا چاہئے۔ کیونکہ جب غصے کی کیفیت طاری ہو جائے تو صمیمیت اور دوستی کا وجود اٹھ جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ بہت زیادہ حساسیت کا مسئلہ ہے۔ ضروری ہے کہ بچے سے جب خطا سرزد ہو

تو مناسب طریقے سے اسے سمجھایا جائے۔ اور اگر بچے سے غلطی سرزد ہوتے ہی والدین طیش اور غصے میں آکر اختیاری کیفیت سے باہر نکل جائیں تو اس صورت میں جو کام کریں گے غیر منطقی اور غیر عقلی ہوگا۔ لہٰذا صمیمیت کے لئے ضروری ہے کہ جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو کوئی فیصلہ کیا جائے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ:

اگرچہ بچوں کو مارنا، گالیاں دینا اور چیخ و پکار کرنا ----- غلط ہے لیکن اس کی غلطی کے مقابلے میں خاموش تماشائی بنے رہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کی صورتحال میں ضروری ہے کہ بچوں کو حسن اخلاق کے ذریعے سرزنش کی جائے اور اسے غلطی کے انجام سے ڈرایا جائے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ان غلطیوں کے سرزد ہونے سے پہلے ہی ایسی منصوبہ بندی کی جاتی کہ جس سے انسان ان کے بھیانک انجام سے بچ جاتا۔

یہاں پر ایک اور مسئلہ کو مسطح کرتا ہوں کہ:

"ہمیں یہ توقع ہرگز نہیں رکھنی چاہیئے کہ ہمارے بچے ہمارے مطیع محض بن کر رہیں گے"

واقعاً" چھوٹے بچے اور تین چار سالہ بچے والدین کے حکم کے سامنے سرتابی کریں یا بے پرواہی سے کام لیں تو والدین اچھا محسوس کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ اس بچے کی بھی ایک شخصیت اور ارادہ ہے۔ یہ بھی انسان ہے اور اسے بھی اللہ تعالیٰ نے آزاد پیدا کیا ہے۔ خدا کی قسم اگر یہی آزادی انسان کے رشد کا باعث بنے اور اس کی راہنمائی کرے تو اس کی عقل مضبوط ہوگی اور اس سے انسان کامل بنے گا۔ اور اگر انسان یہ رشد اور مضبوطی کھو بیٹھے اور فکر اور بات کرنے سے عاجز ہو جائے تو اس

صورت میں اس کی استعداد و صلاحیت دب جاتی ہے۔

اگر آپ کسی تر و تازہ کونپل پر جو نہایت تازگی کے ساتھ زمین کو شگافتہ کر کے باہر نکل رہی ہو ---- بھاری پتھر رکھ دیں تو مسل کر ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس کی نشوو نما کے وسائل کو بروے کار لاتے ہوئے اس پر محنت کی جائے یعنی اسے کھاد و پانی دیا جائے تو وہ بہت جلدی زمین سے نکل کر نمو پائے گی۔

اسی طرح اگر کوئی بچہ ادھر ادھر سرگرداں ہو کر منحرف ہو جائے تو اس کی راہنمائی کرنا چاہئے اگر اس پر کوئی آفت حملہ آور ہو تو اسے بچانے کی تدابیر کی جائیں اور اسے تحفظ فراہم کیا جائے تاکہ وہ آزادی کے ساتھ آگے بڑھے۔

ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ --- ہمارے بچے اپنی فکر اور سوچ نہیں رکھتے ان کی کوئی شخصیت نہیں ہے' یہ کسی شے کی بابت تصمیم نہیں کر سکتے لہٰذا یہ ہمارے حکم کے ماتحت بھاگتے رہیں اور ہم کہیں یہ کرو' وہ کرو' یہ نہ کرو' وہ نہ کرو' ادھر نہ جاؤ' یہاں بیٹھو' چپ رہو تو وہ بچہ جس پر روزمرہ یہ کیفیت طاری رہے' کبھی بھی اچھے برے میں تمیز نہ کر سکے گا اور پختہ ارادہ سے بھی عاری ہو جائے گا۔

بنا برایں ----- ہم اپنے بچے کو نہ تو شتر بے مہار کی طرح آزاد کر دیں کہ جو جی میں آئے کرتا پھرے اور نہ ہی اس سے یہ توقع رکھیں کہ ہم جو کچھ کہتے جائیں وہ اس پر عمل کرتا رہے۔ بلکہ ہمیں چاہئے کہ اس سے مناسب بات کہی جائے مثلاً:

جب کوئی بچہ بیٹھا پڑھ رہا ہو یا کسی مشکل کام سے دوچار ہو اور ادھر ہم اس پر حکم ٹھونس دیں کہ بیٹا جاؤ پانی لے کر آؤ۔ یا جاؤ دروازہ کھولو تو یہ مناسب نہیں ہوگا اس صورت میں نہ صرف یہ کہ اسے کوئی حکم نہ دیا جائے بلکہ اس کے لئے ایسے سازگار حالات پیدا کئے جائیں کہ وہ اپنے کام اور اپنی صلاحیت میں نکھار پیدا کر سکے۔ بنا

برایں ---- اگر بچہ غلطی کرے اور والدین اسے اچھے طریقے سے سمجھائیں تو یہ صمیمیت پیدا کرنے کے لئے بہترین اصول ہے۔

پنجم: بچوں کی اچھی کارکردگی کو اہمیت دینا

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ہمیشہ انسان دوسرے شخص میں کمزوری کو تلاش کرتا رہتا ہے لہٰذا اس بری روش کو چھوڑ کر ہمیں دوسروں کی خوبیاں تلاش کرنا چاہئیں۔

ہم کون ہوتے ہیں لوگوں کی برائی اور اچھائی کو اچھالنے والے!

خدا عادل ہے خود ان کا حساب کتاب لے لے گا خود ہی انہیں جزا اور سزا دے گا خود ہی انہیں ثواب اور عقاب دے گا۔

اس کے علاوہ خود اللہ تعالٰی کا فرمان ہے: **من جاء بالحسنة فله عشر امثالها** (انعام/۱۶۰)

ہم تمہیں ایک نیکی کے بدلے میں دس نیکیوں کا ثواب دیں گے۔

اگر ہمارا بچہ کسی کام میں دیر کر دے یا کلاس میں اچھے نمبر حاصل نہ کر سکے اگرچہ اس نے اچھا نہیں کیا--- ہم اس کی اس کارکردگی پر اس سے ناراض ہو جاتے ہیں اور واویلا کرتے ہیں اور مواخذہ کرنے تک اتر آتے ہیں۔

ہمیں سوچنا چاہئے کہ جب وہ بارہا اچھے کام کرتا ہے تو انہیں ہم اپنی خاطر میں کیوں نہیں لاتے؟ جب وہ اپنی ذمہ داری ٹھیک طریقے سے سرانجام دیتا ہے، مسواک کرتا ہے، لباس کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتا ہے یا گھر کے کام کاج میں والدین کا ہاتھ بٹاتا ہے تو اس وقت اس کے کاموں کو اہمیت کیوں نہیں دی جاتی؟

بنا برایں ----- مثبت کاموں کو سراہنا بھی صمیمیت کے اصولوں میں سے

ہے۔

ششم: بحث اور گفتگو کے لئے صمیمانہ ماحول کی فراہمی

انسان کو چاہئے کہ ----- وقت نکالے جس میں اپنے بچوں کو قصے' کہانیاں سنائے۔ یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کھیلے ---- بعض والدین اور بچوں کے درمیان بہت زیادہ ہم آہنگی ہوتی ہے۔ والدین بچے کو بحث مباحثہ کے لئے موضوع دیتے ہیں جس پر وہ سب بحث کرتے ہیں۔

ہم والدین سے چاہتے ہیں کہ ---- وہ بچوں کے ساتھ بات چیت کریں' ان سے دریافت کریں کہ آج تمہیں کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا؟ سکول اور راستہ میں کیا کیا دیکھا ہے؟ استاد نے کیا کچھ کہا ہے؟ کلاس کی وضعیت کیسی تھی؟ آج تم نے کیا یاد کیا ہے؟

ان سوالات کے بعد اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا جائے

باقی یہ رہا کہ انہیں کیا اور کیسے کیا جائے اس کی بحث اپنے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ البتہ طے ہے کہ ہم انہیں بری عادات نہ سکھائیں۔

کبھی انسان صمیمیت پیدا کرنے کے لئے دوسروں سے بات چیت کرتا ہے تو ان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس کی بات کو سننا گوارا نہیں کرتے' جلدی جلدی اپنے ہاتھوں کو ملتے ہیں' اِدھر اُدھر ہوتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اس کی بات جلدی ختم ہو اور ہماری زحمت تمام ہو۔ لیکن اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ جب کوئی بات کر رہا ہو تو اس کی بات کو توجہ سے سنا جائے حتیٰ کہ وہ آپ کی نگاہ کا مرکز بنا رہے۔ اس کی بات پر جا بجا حسب ضرورت مسکرانا بھی چاہئے اور اس کی باتوں میں غور و فکر کرنا چاہئے۔ بات کرنے والے کو بھی چاہئے کہ وہ پر مغز گفتگو کرے۔

ہفتم: گھریلو امور میں بچوں سے ان کی رائے طلب کرنا

یہ کبھی نہ سوچیں کہ میں جو مکان تبدیل کرنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں یہ چھ یا دس سال کا بچہ مشورہ نہیں دے سکتا۔ بلکہ بچے کو اہمیت دیتے ہوئے اس سے مشورہ طلب کریں۔

اس سے پوچھیں کہ آج دوپہر کے کھانے کیلئے کیا پکانا چاہئے؟

کل جو مسافرت پر جانا ہے تو کس راستہ سے چلیں؟

کس وسیلہ کے ذریعے جائیں؟ بس پر یا ٹرین پر یا کار پر یا ہوائی جہاز پر۔ بچوں سے مشورہ کریں اور انہیں اپنی رائے بیان کرنے کی اجازت دیں اور اگر ان کی ناقص رائے ہو تو اس کی اصلاح کریں۔ اور دلیل کے ساتھ ثابت کریں کہ فلاں راستہ اختیار کیا جائے یا فلاں طریقے سے کھانا تیار کیا جائے تو بہتر ہے۔ اور اگر بچے اچھی رائے دیں تو ان کی رائے کے مطابق عمل کریں۔ خصوصاً اس قسم کا معاملہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ ضرور کریں؟ کیونکہ جب بچے جوان ہو جائیں تو وہ غور و فکر کرسکتے ہیں اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے آپ کے ساتھ رہیں اور آپ سے جدا نہ ہوں تو

شاید آپ نے یہ بات سنی ہو ------ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مسجد سے نکل کر گھر کی طرف تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک بوڑھی عورت نے مسئلہ پوچھنے کے لئے روک لیا۔ عدی بن حاتم (معروف حاتم طائی کا بیٹا جو ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا) --- نے دیکھا کہ آنحضرتؐ نہایت اطمینان کے ساتھ اس کی بات سن رہے ہیں اور خوش اخلاقی کے ساتھ اسے جواب دے رہے ہیں۔ عدی کہتا ہے جب میں نے یہ کیفیت ملاحظہ کی تو سمجھ گیا کہ یہی پیغمبر اکرمؐ ہیں جن کا انداز بادشاہوں اور رئیسوں سے جدا ہے اور ان کا تعلق لوگوں کے ساتھ ہے۔ یہی صورتحال دیکھ کر عدی کوئی معجزہ طلب کئے بغیر ایمان لے آیا۔

دوسروں کے سامنے ان کی برائی نہ کریں۔ امور خانہ داری میں ان سے مشورہ کریں؟ اور ان کے ساتھ ہم راز بن کر رہیں۔

اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے علاوہ وہ کسی سے دوستی یا مشورہ نہ کریں؟ بلکہ مقصد یہ ہے کہ انہیں ہماری اور ہمیں ان کی زندگی میں پیش آنے والے حالات سے آگاہی رہے۔

البتہ!

ان سے زبردستی حالات اور راز دریافت کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ گھر میں ایسا ماحول بنانا چاہئے کہ وہ خود بخود اپنے بارے میں روز مرہ کی رپورٹ دیں ---- اکثر بچوں کو یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا مطلب ہر کس و ناکس کے سامنے بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ بلکہ صرف اپنے بعض دوستوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔

دور کیوں جاتے ہیں اپنے ہی بارے میں سوچیں کہ اگر ہمیں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو جلدی کرتے ہیں کہ کوئی دوست ملے اور اس کے سامنے بیان کریں۔

ہمیں چاہئے کہ گھر کا ایسا ماحول بنائیں کہ ہمارے بچے سب سے پہلے اپنی بات ہم ہی سے بیان کریں۔

ہشتم: ہمکاری و تقسیم مسئولیت

ہم پسند کرتے ہیں کہ ہمارے بچے ہمارے ساتھ مل جل کر کام کریں۔ یہ بات بہت اچھی اور ضروری ہے۔ پس مشق اور تمرین کے طور پر کیا حرج ہے کہ ہم کاموں کو بچوں اور بڑوں میں بانٹ دیں؟ اور تقسیم میں ان کی عمر اور طاقت پیش نظر رکھیں۔

مثلاً

ایک کا کام دسترخوان بچھانا ہو'

ایک برتن دھونے میں مدد دے'

ایک بازار سے سامان خرید کر لائے۔

ان کاموں کو انصاف و عدل کے ترازو میں رکھ کر تقسیم کرنا چاہئے ----- لیکن ان سے ان کاموں کی جواب دہی کی جائے۔ برا نہیں کہ گاہے بگاہے ان کی ذمہ داریوں کو تبدیل کر دیا جائے۔ اگر تقسیم کار کا نظام نہ ہو تو کبھی کبھار غیر عادلانہ طور پر ایک بچے پر زیادہ کام ڈال دیا جاتا ہے۔ مثلاً":

ماں یا باپ جمعہ کے دن آدھے دن کا کام ایک بچے کے سپرد کر دیں۔ اس طرح کہ باغیچہ کو پانی دے' بازار سے سودا سلف لائے اور کئی دوسرے کام بھی کرے۔ اور جب حساب کیا جائے تو معلوم ہو کہ دوسرے بچوں کے لئے تو کوئی کام نہیں بچا۔

یہ بات بہت زیادہ مفید ہے کہ جب ماں باپ مسافرت پر جائیں تو کام کو اپنے درمیان تقسیم کرلیں تاکہ یہ بچوں کی عادت میں شامل ہو جائے۔

ممکن ہے کہ ہم اپنے کاموں میں بہت زیادہ فعال ہوں لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر بہت سے کاموں کی طرف متوجہ ہی نہ ہوں۔

نہم: بچوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کریں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے وفادار ہوں تو ان سے عادلانہ رویہ اختیار کریں اس لئے کہ بچے واقعاً" حساس مزاج ہوتے ہیں مثلاً"

فرض کریں آپ بازار سے سیب خرید کر لاتے ہیں ایک بچے کو بڑا سیب اور دوسرے کو چھوٹا سیب دے دیں۔ یا دسترخوان پر ماں ایک بچے کو اسٹیل کی پلیٹ اور

دوسرے کو سلور کی پلیٹ میں کھانا ڈال کر دے۔ تو بچہ فوراً" محسوس کرے گا کہ ماں نے کس لئے ایسا رویہ اختیار کیا ہے؟

اسی شے کا مظاہرہ خرید و فروخت کے وقت' بات چیت کے وقت' بچوں کو سرزنش کرتے وقت ----- ہوتا ہے۔

فرض کریں آج کسی بچے کا پاؤں کسی برتن سے ٹکرایا جس سے وہ برتن ٹوٹ گیا اور آپ اسے سرزنش اور تنبیہہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی دن کوئی دوسرا بچہ یا بچی یہی کچھ کر بیٹھے اور آپ کو پروا تک نہ ہو تو حساس بچہ سوچے گا کہ:

کل مجھے تو تنبیہہ کی گئی تھی لیکن آج ------؟!

پس چاہئے کہ بچوں کے درمیان یکساں سلوک روا رکھا جائے اور کسی بھی موقع پر اس اصول سے روگردان نہ ہوا جائے۔

کلاس میں استاد بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ چاہئے کہ استاد تمام طلبا کے ساتھ یکساں سلوک کرے' ہر ایک کی بات کو سنے اور ہر ایک کو غلطی پر سزا دے۔ ایسا نہ ہو کہ لائق طلبا سے تو سبق سنے اور ضعیف و ناتواں طلبا کو فراموش کر دے یا نالائق طلبا سے سبق سنے اور لائق طلبا کو نظر انداز کر دے ----- باقی موارد میں بھی برابری کے اصول کی رعایت کی جائے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنی دختر کو بلا کر پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ گلوبند بیت المال سے کیوں لیا ہے؟ اپنے حقیقی بھائی عقیلؓ سے فرماتے ہیں کہ بیت المال سے جس قدر تمہارا حق ہے اس سے زیادہ نہیں دونگا۔ آپ اپنے گھر میں اور رشتہ داروں میں یکسانیت کے اصول کو جاری فرماتے تھے تاکہ بعد میں یہ اعلان کر سکیں کہ "بخدا ظالم کے حلق سے مظلوم کا حق چھین لوں گا اگرچہ ظالم طاقتور ہی کیوں نہ ہو۔ اور مظلوم کی

داد رسی کروں گا اگرچہ وہ (امت کے) کمزور ترین افراد میں سے ہو"

کون ہے جو یہ اعلان کرے اور تاریخ اور تمام لوگ کہیں کہ اس نے سچ کہا! وہی یہ اعلان کر سکتا ہے جو پہلے سے اپنی اولاد میں اور رشتہ داروں میں یکسانیت کے اصول کا اجرا کر چکا ہو۔

دہم: اپنے خانوادہ کے افراد کے درمیان جہاں بینی کی فکر پیدا کریں

ہم نے کتب کا مطالعہ کیا' مطالب کو سنا' مجالس میں شرکت کی' خاص قسم کے وعظ و نصیحت سے آشنائی حاصل کی اور ان سب میں ایک مشترک شے کو پایا کہ ہماری نئی نسل ان معارف سے آگاہ نہیں ہے بلکہ وہ دوسروں کی کتب کا مطالعہ کرتے' دوسروں کی مجالس میں شرکت کرتے اور دوسروں کے مطالب سنتے ہیں۔

ایک ہی شے بچے کے نزدیک کچھ اور باپ کے نزدیک کچھ ہوتی ہے۔ بچہ خدمت کو جانتا ہے لیکن باپ اسے کسی اور شکل میں پہچانتا ہے چنانچہ ان کی معلومات آپس میں تفاوت پیدا کر جاتی ہیں۔ لہٰذا اب کیا کیا جائے تاکہ ہماری اور ان کی زندگی میں فکر کی سطح مشترک ہو جائے؟

وہ جو کتاب ہمارے بچے کو دیتے ہیں یا ہمارا بچہ اسے خود خرید کر مطالعہ کرتا ہے اس کے بارے میں ذرا زحمت کریں اور خود بھی اس کتاب کی ورق گردانی کریں ----- جب بچے بڑے ہو جائیں اور ان میں ہر کتاب پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو اس وقت ہمیں چاہئے کہ جو کتاب اپنے مطالعہ کے لئے لائیں اپنے بچوں کو بھی دیں تاکہ وہ اسے پڑھیں۔ انہیں تبلیغی پروگراموں میں اپنے ساتھ لے جائیں اور اگر ممکن ہو تو جن پروگراموں میں بچے شرکت کرتے ہیں خود بھی ان میں جائیں۔ اس صورت

میں جہان بینی کی بابت ہماری اور بچوں کی فکری سطح یکسانیت اختیار کرے گی۔ اس روش سے امید کی جاسکتی ہے کہ صمیمیت کا ماحول پیدا ہو جائے "انشاء اللہ" (البتہ ہم صمیمیت ہوا و ہوس کے لئے اور اس لئے پیدا نہیں کرنا چاہتے کہ وہ ہمیں دوست رکھیں بلکہ ان کی تربیت کے لئے صمیمیت کی ضرورت ہے)

آخری بات جو عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ:

اگر آپ کسی واعظ کو پسند نہ کرتے ہوں تو اس کی باتیں آپ کے دل پر اثر بھی نہیں کریں گی۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہی کہیں گے کہ یہ اچھا ہنر مند ہے' باتیں اچھی کرتا ہے۔

آپ اگر اپنے بچوں کی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ بچے آپ سے پیار کرتے اور آپ کا احترام کرتے ہوں۔ اور آپ کی شخصیت کے قائل ہوں۔ تب تو آپ ان کی تربیت کر سکتے ہیں اور اگر ان کے دل میں آپ کی کوئی شخصیت اور اہمیت نہ ہو تو آپ کس طرح ان کی تربیت کر سکیں گے اور کس طرح سے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں سیدھے راستے پر چلا سکیں گے؟ لہٰذا تربیت کی ایک بنیاد صمیمیت ہے۔ چنانچہ ارشاد پروردگار ہے:

"----- **ولو کنت فظا غلیظ القلب لا انفضو من حولک** -----"

(سورہ آل عمران آیت ۱۵۹)

"اے پیغمبر! اگر تو غصے والا اور سخت مزاج اور بد اخلاق ہوتا تو یہ لوگ تیرے گرد سے تتر بتر ہو جاتے۔"

آپ تو لوگوں سے محبت کرتے ہیں' ان سے عشق اور پیار کرتے ہیں' ان کے ساتھ صمیمیت اور ارادت رکھتے ہیں اور وہ بھی آپ سے ارادت رکھتے ہیں لہٰذا یہ

سب آپ کے حکم کے پروانے ہیں اور آپ کے فرمانبردار ہیں۔ ورنہ جس جگہ اعتماد، قلبی صفائی اور شخصیت و اہمیت نہ ہو وہاں معنویات اور روحانیت اثر نہیں کر سکتیں۔

خداوندا!

ہمیں توفیق عطا فرما ----- کہ تیرے مقدس احکامات کے اجرا میں کوشاں رہیں۔

ہمیں اپنے بچوں کی تربیت کی توفیق عنایت فرما تاکہ ہمارے بچے ہماری آنکھوں کا نور، ہماری امیدوں کا آسرا اور ہماری آئندہ زندگی کا سہارا بنیں۔

" ----- **ربنا هب لنا من ازواجنا و ذرياتنا قرة اعين واجعلنا للمتقين اماما**" (سورہ فرقان آیت ۷۴)

پروردگارا! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد کی طرف سے ٹھنڈک عطا فرمااور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا بنا۔

گھر اور تعلیمی اداروں میں ہم کاری

ایک مطلب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ---- اور وہ گھر اور تعلیمی اداروں کا آپس میں رابطہ ہے۔ وہ شے جس کے ذریعے گھر اور مدرسہ میں ہم کاری پیدا کی جاسکتی ہے وہ بچہ کی تربیت ہے۔

کسی مملکت کی تمام تر تشکیلات' وزیر سے لے کر عام مزدور تک' پرنسپل سے لے کر ایک عام استاد تک' سب کے سب طالب علم کی تربیت کے لئے کام کرتے ہیں ان کی تمام تر کوششیں اسی کے لئے ہیں۔ کیونکہ کل ملک کی باگ ڈور انہی کے ہاتھوں میں ہوگی۔ بڑے' بزرگ جن جن عہدوں پر فائز ہیں اور کام کر رہے ہیں کل کو ان کی سیٹیں خالی ہو جائیں گی اور یہ سب کام انہی نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہوں گے۔

بچے کی تربیت میں وراثت کا اثر

اب تک تکرار کے ساتھ سنا جاچکا ہے کہ بچے کی شخصیت کو دو زاویوں سے جانا جاسکتا ہے۔

۱۔ وراثت کے حوالے سے: یعنی وہ شے جو بچہ ماں باپ' علاقے' طبع' تاریخ سے پاتا ہے

۲۔ اکتسابی حوالے سے۔

بچہ ان دونوں پہلوؤں کا مجموعہ ہے ایک کا تعلق بچے کے خواستہ و چاہت کے بغیر اور اس کے انتخاب اور تصمیم کے بغیر ---- اس کے وجود میں دخیل ہے۔ جیسے قیافہ' شکل و صورت' بالوں کی رنگت ------ یہ سب طبعی پہلو ہیں اور یہ سب خداداد چیزیں ہیں لیکن اس سے مقصود یہ ہے کہ بچہ جغرافیائی اور طبعی ماحول میں سکونت پذیر ہے' ایک ماں اور باپ سے دنیا میں آیا ہے اور اس میں قیافہ' روحیت اور مخصوص

خصوصیات ہیں۔ اور ادھر معنویات پر بھی محتوی ہے۔ بچہ جن موروثی خصوصیات کے ساتھ دنیا میں آیا ہے ان میں تغیر و تبدل بہت مشکل کام ہے البتہ! ایک نسل فکر اور تدبر سے سوچ بچار کر سکتی ہے کہ ان میں سے بعض موروثی خصوصیات مستقبل میں تبدیل ہو جائیں گی۔ مثلاً:

اگر ایک نسل کے لوگوں کا ماحول اس طرح کا ہو کہ ان کی قامت چھوٹی ہو۔ وہ کوشش کریں تو ان کی آئندہ نسل میں آنے والے بچوں کے قد بڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: جاپانیوں نے کئی سال بہت زیادہ کوشش کی ہے اور اس کوشش کے نتیجہ میں چھوٹے قد سے کچھ سینٹی میٹر قد بڑھ گیا ہے اس بارے میں مزید کوشش مزید اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔

زلزلے اور حادثے کا بروقت پتہ چلتا ہے پہلے سے پتہ چلانا مشکل ہے البتہ اگر اس بارے میں غور و فکر کیا جائے عمارت کو سریا اور سیمنٹ کے ذریعے مضبوط بنایا جائے تو اس سے نقصانات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

لہٰذا ایک جامع مستقبل کے حوالے سے بہت زیادہ غور و فکر کریں تاکہ آئندہ نسلوں میں موروثی مسائل میں تبدیلی واقع کی جاسکے۔ البتہ اب موجودہ پود موروثی حوالے سے قابل تفسیر ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ بہت دقیق مطالعہ کا محتاج ہے۔

دوسرے گروہ کا تعلق ان مسائل کے ساتھ ہے جو بچے کی تربیت اور شخصیت کی تشکیل میں کسب سے متعلق ہیں۔ ضروری ہے کہ تدریجاً ایسا ماحول پیدا کیا جائے۔ جو گھر اور تعلیمی اداروں اور معاشرہ کا ماحول ہو۔ اب ہم معاشرہ کے بارے میں گفتگو نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ ماحول اس وقت ہمارے بس میں نہیں ہے۔

یہ تقریر انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی سے پہلے کی ہے (د)

اجتماعی ماحول کو بھی موروثی مسائل کی طرح بہت جلد تبدیل کر دیا جائے گا تاہم کس طرح معاشرہ اور اجتماع میں بچوں کی تربیت کی جائے کہ وہ اجتماعی مفاسد سے محفوظ رہیں۔ یہ مسئلہ بھی اپنی حیثیت سے قابل بحث ہے۔ لیکن اب اجتماعی سوسائٹیوں کا ماحول ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے۔

اقتصادی' سیاسی' تاریخی' عمومی تربیتی مسائل' لوگوں کے ارتباطی مسائل ہمارے لئے ایک ماحول پیدا کرتے ہیں جو ابھی ہماری بحث سے خارج ہیں۔

البتہ!

دو ماحول جو بچے کی زندگی پر اپنے اثرات چھوڑتے ہیں وہ گھر اور اس کا تعلیمی ادارہ ہے۔

ذرا سوچیں تو سہی!

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی بھی زبان' عادت' طرز معاشرت' طرز فکر و جہان بینی سے مانوس نہیں ہوتا۔ لیکن آہستہ آہستہ پانچ سال کے بعد یا دس سال کے بعد ایک خاص ماحول میں رشد پاتا ہے ایک زبان یاد کر لیتا ہے' ایک فلسفہ اور فقہ کا مالک بن جاتا ہے' ایک مذہب کا پرستار بن جاتا ہے' ایک قسم کے آداب و عادات کا پروردہ بن جاتا ہے وہ ان تمام چیزوں کو ماں کے پیٹ سے نہیں لایا تھا بلکہ انہیں گھر' مدرسہ' جامعہ (سوسائٹی) سے سیکھا ہے۔

پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے چنانچہ گھر ہی میں وہ اپنا پہلا قدم اٹھاتا ہے۔ پہلے پہل باتوں کو ماں ہی سے سیکھتا ہے۔ البتہ یہ ہمارا اصلی موضوع کلام نہیں ہے۔ فقط ہم یہ چاہتے ہیں کہ گھر اور مدرسہ کے درمیان ربط پیدا کیا جائے۔ چھ سال تک بچہ گھر کی چار دیواری کے اندر تربیت پاتا ہے لہٰذا دیکھنا ہے کہ گھر والوں نے اس کے ساتھ کیسا برتاؤ

کیا؟

اس کے بارے میں ہمیں کوئی پتہ نہیں ----- ہماری بحث عمر کے ساتویں سال سے شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی سال وہ مدرسہ میں داخل ہوتا ہے۔ ایک طالب علم پانچ سے سات گھنٹے تک مدرسہ میں اور باقی وقت گھر میں گزارتا ہے۔ گرمیوں کی ساڑھے تین ماہ کی چھٹیوں میں بھی گھروالوں کے سپرد ہوتا ہے۔ اسے گھر اور مدرسہ سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

بعض لوگ قائل ہیں کہ بچہ عمدہ وقت گھر میں نیند کی حالت میں گزار دیتا ہے اور اپنی فعال گھڑیاں مدرسہ میں گزارتا ہے۔ البتہ ! ہم ----- مدرسہ یا گھر کے ماحول سے اچھا کونسا ہے اس بابت بحث نہیں کرنا چاہتے بہرحال یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں اور بچہ ان دونوں سے تعلق رکھتا ہے کبھی گھر کے دروازہ سے اور کبھی مدرسہ کے دروازہ سے اور پھر صبح دوبارہ اسی معمول کو شروع کر دیتا ہے اور اسی طرح اس کی زندگی کے قیمتی دن گزرنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ارادی اور غیرارادی تربیت

عموماً" مدرسہ میں بچہ کی دو قسم کی تربیت ہوتی ہے۔

ایک عمومی اور ارادی تربیت

دوسری غیرارادی تربیت

یعنی:

تربیت ارادی میں کتاب اور سبق معلوم ہوتا ہے اور سر فہرست عنوانات موجود ہوتے ہیں مدرسہ کی مسجد میں جاتا ہے تو نماز کے مسائل سے آگاہی پاتا ہے۔ کلاس میں

جاتا ہے تو استاد اچھی باتیں سناتا ہے۔ مدرسہ کے صحن میں جاتا ہے تو دیواروں پر لکھے ہوئے اقوال زریں ملاحظہ کرتا ہے یہ سب عمومی اور ارادی تربیت کے ذرائع ہیں۔ اس لحاظ سے مدرسہ کی بہت زیادہ ذمہ داری ہے۔ استاد کو منتخب کرنا' پیریڈ کی تقسیم بندی' کلاس کے پروگرام اور مسجد ---- کیسے ہیں؟ اگلا پروگرام کیا ہے؟ اسباق کے علاوہ جس کتاب کی معرفی کی گئی ہے کون سی ہے؟ استاد سے کس طرح کی بات چیت متوقع ہے؟ استاد نے جو مطالب بیان کئے ہیں کیا حساب شدہ ہیں؟ جن کہانیوں کے بارے میں بتایا گیا ہے ان پر کس قدر تحقیق اور کام ہوا ہے؟ یہ سب مدرسہ کی بہت اہم ذمہ داریاں ہیں۔ یہ معاملات مدرسہ کو مدرسہ بناتے ہیں۔ فلاں مدرسہ جو فرسٹ آیا ہے انہی اسباب کی بدولت ہے۔

مدرسہ کا دوسرا حصہ غیر ارادی تربیت کا ہے۔ استاد میں کئی خصوصیات ہوتی ہیں۔ مثلاً" دوران تدریس کس طرح کام کرے کہ ایک ایک طالب علم تک پہنچ سکے؟ اور عملی طور پر یکسانیت کا سلوک روا رکھے؟ ہوسکتا ہے استاد متوجہ نہ ہو کہ ریاضی کے سبق میں عدالت اور راستگوئی کا درس بھی دیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ سہوا" وعدہ

(یہاں والدین غیر مسئول نہیں ہیں۔ اس لئے کہ مدرسہ میں جس قدر اچھے اچھے پروگرام ہوں ان کی تائید گھر کے ماحول سے بھی ہونا چاہئے۔ گھر والے ہی اچھے استاد اور اچھی کتاب کے ذریعے مدرسہ کی مدد کر سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہنا چاہئے کہ مدرسہ میں کئی مسئول ہیں۔ لہٰذا سارے محنت کریں' سختیاں جھیلیں اور مدرسہ کو بہتر کارکردگی کا موقع فراہم کریں۔ بلکہ ان مسئولین کے ساتھ ہمکاری کی جائے لہٰذا اگر میں اور آپ کسی اچھے مدرسہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہیں تاکہ اس اچھے مدرسہ میں بچہ اچھی تربیت پائے ---- سوچا جائے کہ اس مدرسہ کے اچھا ہونے کے لئے ہم نے کیا اقدامات کئے ہیں - اس کی عمارت کے لئے کتنا خرچہ کیا ہے؟ اس کی کتنی مدد کی ہے اور اس مدرسہ کے ساتھ کتنی ہمکاری کی ہے؟)

کرے اور اس کو پورا نہ کرے مثلاً" کل کاپیاں چیک کروں گا لیکن دوسرے روز کاپیوں کو نہ دیکھے یا کہے کامیاب ہونے والوں کو انعام دونگا اور انعام نہ دے۔ یہاں طالب علم سمجھتا ہے کہ غیر عادلانہ روش کا مظاہرہ کیا گیا ہے ---- یا استاد سوال کرے اور اس کی نظر میں چند ذہین طلبہ ہوں۔ پس وہ بالواسطہ عدالت کا یا غیر عدالت کا درس دے رہا ہوتا ہے۔ سچائی یا جھوٹ کا درس دے رہا ہوتا ہے۔

طلبا استاد کے لباس اور قیافہ کو دیکھتے ہیں اور وہ منظم یا غیر منظم ہونے کا سبق سیکھتے ہیں۔ وہ استاد سے خوش اخلاقی اور پیار و محبت کا سبق سیکھتے ہیں یا نفرت کا درس سیکھتے ہیں کلاس کے در و دیوار' وسعت روشنی اور مدرسہ کی عمومی عالت بچے کی شخصیت بنانے اور تربیت میں گہرا اثر رکھتی ہیں۔ یہ غیر ارادی تربیت کا ایک سلسلہ ہے جو طالب علم کی تربیت میں ہمیشہ اثر انداز ہوتا ہے۔

مدرسہ میں اخلاق' برخورد' رابطہ معلم' اداریت مدرسہ' وسعت' نور اور باقی عمارتی خصوصیات اہمیت کی حامل ہیں ---- بنا بریں بچے کی تربیت میں مدرسہ کا گہرا تعلق ہے جس میں سے کچھ حصہ ارادی اور کچھ حصہ غیر ارادی ہے۔

نقش منزل

عموماً" ہر خاندان کے لئے گھر ایک غیر ارادی تربیت گاہ ہوتی ہے۔ یعنی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ باپ بیٹے کی تربیت کے لئے باقاعدہ پروگرام بنائے کہ اس کے لئے کون سی کتاب مفید ہے جو اسے مہیا کی جائے؟ بچے پر کنٹرول کرے کہ اس کے لئے ---- کونسا پروگرام بہتر ہے؟ کونسا رسالہ مفید ہے؟ ٹیلی ویژن کا کونسا پروگرام تربیتی ہے؟ اسے فلاں رشتہ دار کے گھر لے جانا بہتر ہے یا نہیں؟ یہ جس سفر پر جانا چاہتا ہے

اس کے لئے بہتر و خوش آئند ہے یا نہیں؟

اگرچہ بعض ایسے افراد اور خاندان ہیں جو ان معاملات پر توجہ دیتے ہیں لیکن شاید اکثر افراد برنامہ سازی نہیں کرتے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بچوں کی تربیت کا خیال نہیں رکھا جاتا ان کے ساتھ فحش اور گندی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ سستی یا سختی سے پیش آیا جاتا ہے۔ اور جس طرح ہو وقت گزاری کی جاتی ہے۔

لیکن!

یہ دن رات میں ایک گھنٹہ بھی یہ سوچنے کے لئے نہیں رکھتے کہ ہماری یہ روش بچوں کی تربیت پر کیا اثرات چھوڑ رہی ہے؟

میں نے جو کمرے میں ٹیلی ویژن آن کر دیا ہے جبکہ بچے اپنی تکلیف (سکول کا کام) کر رہے ہیں۔ کیا ٹیلی ویژن کی جاذبیت بچوں کو سکول کا کام کرنے دے رہی ہے؟ وہ والدین جو بچوں کی تربیت پر توجہ نہیں دیتے ان کے لئے بہت زیادہ مسائل ہیں۔ اگرچہ کئی خانوادے ایسے ہیں جو بچوں کی غیر ارادی تربیت کرتے ہیں۔

پس بچوں کی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ وعظ و نصیحت کی مجالس اور محافل برپا کی جائیں تاکہ وہ تربیت یافتہ بچے بن سکیں۔ اگرچہ یہ کام مشکل ہے۔ یہاں تک کہ تربیت یافتہ خانوادوں کے لئے بھی مشکل ہے۔ اگر یہ بچوں کی تربیت کرنا چاہیں تو مشکل کا سامنا کرنے پڑے گا۔

پس جو بچہ گھر اور مدرسہ کے ساتھ متعلق ہے ---- وہ مدرسہ میں ارادی اور غیر ارادی تربیت باتا ہے۔ اور گھر میں نوے فیصد غیر ارادی تربیت پاتا ہے۔ لہذا کچھ کیا جائے تاکہ تضاد کا شکار نہ ہوں اور دونوں کی تربیت بیکار نہ ہو جائے۔

گھر اور مدرسہ میں بچے کی تربیت کے اصول

یہاں چند مثالیں ذکر کرتا ہوں

مار پیٹ سے پرہیز کیا جائے

ہوسکتا ہے کہ مدرسہ میں بچوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے کہ جس میں انہیں مار پیٹ نہ کی جائے۔ بچے کے لئے مار بہت نقصان دہ ہے۔ یہ نہ صرف مشکلات کو حل نہیں کرتی بلکہ مشکلات میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اور ناراضگی میں اضافہ کرتی ہے۔ ضروری ہے کہ بچوں کے ساتھ اس طرح سے سلوک کیا جائے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ مدرسہ میں یہ تربیتی اصول جاری کیا جائے۔ لیکن جب بچہ گھر جائے ----- تو ذرا سی غلطی پر ماں تھپڑ رسید کرتی ہے۔ جو کام کرنا چاہئے تھا نہیں کیا یا ایسی بات کہہ دی جس سے ماں کو تکلیف پہنچی تو تنبیہہ کے لئے ماں نے تھپڑ مار دیا۔

گالی گلوچ سے پرہیز کیا جائے

ہوسکتا ہے مدرسہ میں یہ طے کیا گیا ہو کہ بچوں کو گالیاں دینا یا ان کی توہین کرنا اچھا کام نہیں ہے۔ کیونکہ ان گالیوں سے بچہ احساس کمتری اور احساس تحقیر کا شکار ہو جاتا ہے۔

البتہ!

جنسی قسم کی گالیاں دینے سے ایک تو ان کی پاکدامنی اور اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور دوسری طرف ان کا بہت زیادہ گناہ بھی ہے۔

جب بچوں کو ان الفاظ کے ساتھ ڈانٹا جائے۔ مثلاً"

حیوان، گدھا، احمق ----- یہ بچے کے لئے بہت سخت تلقین ہے۔ یعنی انسان

نے حماقت کو اختیار کر لیا ہے جس طرح ٹیکہ لگتا ہے بچے کو ایسے ہی یہ باتیں لگتی ہیں۔ جب زور سے اسے کہا جاتا ہے ارے احمق! ارے گدھے! تو اس وقت حماقت ---- بچے میں اثرات چھوڑتی ہے۔ اس قسم کے مفاسد والے مدارس کی تشخیص بچے خود کرتے ہیں۔ یہی بچے جب گھر جائیں گے تو وہاں دوسرے دوستوں کے ساتھ ایسے ہی ہمکلام ہوں گے۔ یہ مسئلہ پہاڑوں سے نکلنے والے سیلاب سے بھی زیادہ تیز ہے۔ ماں یا باپ اپنے بچوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے پرہیز ضروری ہے۔ ورنہ بچے کی مناسب تربیت نہ ہو سکے گی۔

اختلاف پھیلانے سے پرہیز کیا جائے

ممکن ہے کہ مدرسہ میں اس طرح کے قوانین نافذ العمل ہوں کہ طلبا محسوس نہ کریں کہ یہاں کوئی اختلافات ہیں۔ یہاں تک کہ اگر دو استادوں کا آپس میں کوئی اختلاف ہو تو اسے مدرسہ کے دفتر میں بیٹھ کر حل کیا جائے۔ اور انہیں اجازت نہ دی جائے کہ ان کے اختلافات کا درسگاہ یا بچوں کو کلاس میں پتہ چلے۔

مدرسہ کا برنامہ اس طرح مرتب کیا جائے کہ بچے اختلافات کو محسوس نہ کر سکیں بلکہ تمام مدرسہ کو یک جان اور متحد سمجھیں۔

بچہ گھر میں ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسئلہ بنا کر جھگڑتے ہیں اور ہو سکتا ہے ایک دوسرے کو گالیاں نہ دیتے ہوں لیکن ایک دوسرے سے ترش مزاجی سے تو پیش آتے ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے گلہ شکوہ کرتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ ان باتوں سے کم سن بچہ بہت جلد اثر قبول کرتا ہے اور متاثر ہوتا ہے۔ ان میں سے کون صحیح کہتا ہے ماں صحیح ہے یا باپ؟

-------- گھر صحیح ہے یا مدرسہ صحیح ہے؟

مدرسہ میں تو اس کوشش کو جاری رکھا گیا ہے کہ استادوں کے مابین اختلاف ظاہر نہ ہونے پائے۔ لیکن گھر میں ہزاروں اختلافات سرعام بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اب مدرسہ کی تربیت کو ترجیح دے یا گھر کے ماحول کو؟ اختلاف کو ترجیح دے یا اتحاد کو؟

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ----- بابا ہم نے اچھے مدرسے میں بچے کو داخل کرا دیا ہے اب وہ وہاں اچھی عادات سیکھ لے گا --- یہ آخر سال تک اپنے آپ کو آرام میں سمجھتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بیمار آدمی کو گندے پانی سے دوائی دے دی جائے۔ اگر آپ بچے کو چھ گھنٹے اچھے پانی میں ---- جو کیمیائی اعتبار سے بچے کی صحت کے لئے نقصان دہ نہ ہو ----- نہلاتے رہیں اور بعد میں اسے گندے پانی میں چھوڑ دیں تو کیا اب آپ توقع کر سکتے ہیں کہ ہمارا بچہ بیمار نہیں ہوگا ہمیں ----- گھر والوں کو کلی طور پر مطعون نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ گھر کا ماحول اس کے برعکس صاف ستھرا ہو۔

اگر گھر میں اچھا اور صاف ستھرا پانی بچے کو دیا جائے اور سکول میں گندگی سے سامنا کرنا پڑے تو اس سے بچے کے بیمار پڑ جانے کی توقع ہی کرنا چاہئے اگر بچے کو خراب غذا دی جائے تب بھی وہ بیمار پڑ جائے گا۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ صحیح و سالم رہے تو چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت کریں"

میں نہیں جانتا کہ واقعاً" گھریلو ماحول پر جو گفتگو ہوچکی ہے اس کی ضرورت کھانے پینے کی طرح سے تھی؟ یقیناً" یہ کھانے پینے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہماری روح اردگرد کے ماحول سے اچھی یا بری بنتی ہے۔ جس طرح معدہ مادی غذا سے بھرا

جاتا ہے اسی طرح روح کے لئے بھی غذا کی ضرورت ہے۔

اگر انسان جسمانی اعتبار سے بیمار ہو جائے تو پیسہ خرچ کرکے' علاج معالجہ کے ذریعے صحت مل سکتی ہے۔

البتہ!

ہمیں چاہئے کہ روحانی بیماریوں کا بھی علاج معالجہ کیا جائے؟ کیا اخلاقی مفاسد اتنے جلدی قابل جبران ہیں؟ بچہ جو سست ہو چکا تھا اسے نئے سرے سے مستعد اور مسئول بنایا جاسکتا ہے؟

ان مسائل کو مدرسہ کے دفتر میں بیان کرنا چاہئے۔ اور گھر والوں سے کہا جائے ------ بچوں کے محترم گھر والو!

کیا آپ مناسب خوراک بچوں کو دے رہے ہیں؟

سفر اور مہمان نوازی کے بارے میں چند نکات

نوروز یا چھٹیوں کے ایام میں ---- ہم یا تو سفر پر چلے جاتے ہیں یا اپنے شہر میں ہی رہ جاتے ہیں اور عجیب و غریب چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ میں ان میں سے چند باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

الف ۔ بے مقصد گفتگو

اگر آپ کے خاندان کے تیس افراد ہیں۔ آپ ان کی ملاقات اور وہ آپ کی ملاقات کے لئے آتے جاتے ہیں اس آنے جانے کا ہمیشہ تکرار چلا رہتا ہے۔ کیا ان مہمان نوازیوں میں مناسب خوراک دی جاتی ہے واقعاً" چودہ پندرہ دن مال کو ضائع کیا جاتا ہے۔ ہر روز کئی گئی گھنٹے ملنے ملانے میں لگ جاتے ہیں۔

البتہ!

احوال پرسی اور صلہ رحمی دونوں کا ثواب ہے۔ لیکن جو بے مقصد وقت ضائع کیا گیا ہے۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟ واقعا" ان واقعات میں کھانا پکانا ایک اہم موضوع ہے۔ اس موضوع کو خواتین ذہن نشین کرکے لکھیں ---- تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا کیا اثر اور اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟

بڑے بننے کے لئے سبقت لے جانا

ان مہمان نوازیوں میں ایک مسئلہ بڑے بننے کے لئے سبقت ہے۔ ہم ان لوگوں کی اس طرح سے مہمان نوازی کریں گے! یہ کیسے ہوسکتا ہے! اس کے لئے کئی قسم کے کھانے' فروٹ اور مٹھائیاں بھی کم سمجھی جاتی ہیں۔ اگر انہوں نے دس قسم کے کھانے دیئے تھے تو ہم گیارہ قسم کے کھانے دیں گے۔ اور یہ ساری کارروائی عورتوں کے ذمہ ہوتی ہے وہ خود بازار جاتی ہیں اس لئے کہ انہیں پتہ ہے کہ اچھی اچھی چیزیں کہاں سے ملتی ہیں! کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟

البتہ!

درست ہے کہ محفل کو خشک نہیں ہونا چاہئے۔ ملنا ملانا اور کھانا پینا ضروری چیز ہے۔ لیکن اسی حد تک صحیح ہے کہ فضول خرچی میں شمار نہ ہو؟

اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو ایک کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بہت سے اجتماعی مسائل بے توجہی کا شکار ہیں' کتنے موارد ہیں جہاں پیسہ خرچ کرنا ضروری ہے لیکن خرچ کے لئے پیسہ نہیں ہے' کتنے بنیادی کام پیسہ نہ ہونے کے باعث رکے پڑے ہیں۔ یہی سرمایہ ان امور خیریہ میں لگایا جائے۔ تاکہ رکے ہوئے کام پھر سے چل سکیں اور دکھے ہوئے دل خوشحال ہوسکیں۔ اور مال ضائع ہونے

سے بچ جائے۔

برے لوگوں کی طرف آمد و رفت

وہ خاندان جن کے افراد برے ذہن کے ہوتے ہیں ان کے گھروں میں آمد و رفت تربیت کے نقطہ نظر سے موزوں نہیں ہے خصوصاً" ان گھروں میں آویزاں تصویریں افراد کو خراب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

وہاں ان کے بچے جو تعریفیں سنیں گے یا جو باتیں سنیں گے یا جو دعوتیں کھائیں گے یا جو فلمیں دیکھیں گے۔ آپ کے بچے بھی وہی سنیں اور کریں گے۔ اور یہ سب کچھ تربیت کے نقطہ نظر سے مناسب نہیں ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہم سب اس قسم کے خاندانوں کا شکار ہیں لیکن اس ملنے ملانے میں جو تحفے تحائف ملتے ہیں یہ کیا ہیں؟ یعنی خواتین اور بچے جو ان دعوتوں پر جاتے اور واپس آتے ہیں اور جو چیزیں ساتھ لے آتے ہیں یہ سب کیا ہے؟ اس کی بابت بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

د۔ کتاب ہی مناسب عیدی ہے

عید کے موقع پر جب بچے عیدی مانگیں تو انہیں مفید اور تربیتی کتاب عیدی کے طور پر دی جائے! میں نے دو سال تک یہ تجربہ کیا ہے اور یہ مختصر تجربہ تھا انشاء اللہ اس کے دائرہ کو وسیع کریں گے۔

البتہ!

اس تجربہ میں کتابی عیدی کو بہت جالب پایا اور اس میں کسی قسم کا کوئی اشکال بھی نہیں ہے کہ آپ کسی کو عیدی میں جوتے یا پیسے دیں بلکہ ان کے مقابلے میں انہیں

ایک مفید کتاب ہدیہ کریں۔ بجائے اس کے کہ بچے عیدی کے پیسوں کا حساب کتاب کریں کہ اس سال اتنے پیسے اکٹھے ہوئے' پچھلے سال اتنے اکٹھے ہوئے تھے؟ مجھے چچا جان نے اتنی عیدی دی ہے۔ پھوپھی صاحبہ نے اتنی عیدی دی ہے ---- ان باتوں کی بجائے وہ کتاب کا مطالعہ کرے گا۔ اگر یہی طے ہے کہ تحفہ ہی دینا ہے تو کتاب سے بڑھ کر اور تحفہ کیا ہو سکتا ہے؟ اسی سوچ کو رواج دینا چاہئے۔ پس بچوں کو عیدی بھی بامقصد دینی چاہئے (ایسی ہو جو ان کو زندگی میں فائدہ دے)

جہاں جانا ہے اس جگہ کا انتخاب

اگر گرمی کی تعطیلات میں کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بن جائے تو سب سے پہلے جہاں جانا ہو اس کو طے کیا جائے۔ اور اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ وہاں کس غرض سے جانا ہے۔ مثلاً" صحت افزا مقام ہے یا کوئی اور وجہ ہے یا محض اس لئے جانا چاہتے ہیں کہ آپ نے اس جگہ کو پہلے دیکھا ہوا نہیں ہے؟

اور جب وہاں پہنچ جائیں تو دیکھا جائے کہ جن لوگوں سے ملنا ہے یا جس جگہ پر رہنا ہے وہ قابل ذکر ہیں یا نہیں؟ یا عادتاً" سفر کیا جا رہا ہے؟

کیا مسافرت کے لئے کوئی تربیتی پروگرام تشکیل دیا ہے

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لوگ سفر بھی اپنے آپ کو بڑا دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ پہلے زمانے کے لوگوں کے سفر کرنے کا مقصد ہوتا تھا۔ مثلاً"

اگر کوئی سفر کرنا چاہے کہ قم مقدسہ جاتا ہوں یا تہران میں حضرت شاہ عبد العظیمؑ کی زیارت کے لئے جاتا ہوں شاید کہ کوئی مسئلہ حل ہو جائے

لیکن اب ملک کے اندر دور دراز سفر عادت کے طور پر کئے جاتے ہیں اور آہستہ

آہستہ بیرون ممالک بھی سفر کرنا شروع ہوگیا ہے۔ ہر شخص کہتا ہے کہ میں خرچ کرنے میں فلاں سے پیچھے نہ رہ جاؤں۔ اگر خرچ کم کیا جائے تو شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ بنا براین ----- اسلام نے مسافرت کی بابت جو دلیل قائم کی ہے اس سے انحراف ہوچکا ہے۔ حالانکہ خداوند عالم کا فرمان ہے:

"قل سیروا فی الارض فانظر واکیف کان عاقبۃ الذین من قبل"

(سورم روم آیت ۴۲)

اے پیغمبر! کہہ دو تم زمین پر سفر کرو اور اپنے سے پہلے لوگوں کا انجام دیکھو۔

سفر سے مختلف سوسائٹیوں کو دیکھو ان کے بارے میں مطالعہ کرو' ان کی بابت سوچ بچار کرو' ان کی اچھی بری عادات سے آگاہی حاصل کرو اور ان کے صفحہ ہستی سے مٹ جانے پر عبرت حاصل کرو تو تمہارا سفر تمہیں کچھ دے گا تمہاری تربیت کا باعث بنے گا۔ تمہاری روح اور معلومات میں وسعت عطا کرے گا' تعلقات میں اضافے کا سبب بنے گا بلکہ کچھ دنوں کے لئے ہجرت کرو تاکہ اپنے رشتہ داروں سے دور رہ کر خود سازی کرو۔

سفر سے واپسی پر گھر والوں اور رشتہ داروں کے لئے تحفے تحائف لے آنا بھی ایک مصیبت بن چکا ہے۔ گھر والوں اور رشتہ داروں کی طرف سے تحفوں کی ایک فہرست بن جاتی ہے اور کبھی تو وہ ساٹھ' ستر افراد تک کے تحفوں کی فہرست ہوتی ہے۔

اسلام تحفے تحائف اور ہدیہ کو پسند کرتا ہے لیکن ایسا جس میں افراط و تفریط نہ ہو۔ کبھی ایک چھوٹا سا ہدیہ پیار محبت کا باعث بن جاتا ہے۔ جس طرح مہمان نوازی اور مہمانوں کی خدمت ایک اچھا کام ہے لیکن کئی قسم کے کھانے جو افراط و تفریط کا باعث بنیں درست نہیں ہیں لوگ اسے نمود و نمائش کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔

بنا بر این ------ ملنا ملانا' ہدیہ' خریداری' مسافرت کسی ایسے پروگرام کے تحت ہوں جن میں افراط و تفریط شامل نہ ہو۔

خلاصہ بحث

ضروری ہے کہ گھر اور مدرسہ کے درمیان ہمکاری موجود ہو۔ مدرسہ ایک تربیت گاہ ہے ۔ اگر مدرسہ میں صحیح طریق کار نہ ہو تو ضروری ہے کہ والدین انہیں تذکر و نصیحت کریں۔ اگر مدرسہ میں صحیح طریق کار ہو تو اس کے اجرا میں والدین ہمکاری اور تعاون کریں تاکہ بچے کی تربیت میں تضاد پیدا نہ ہو۔ اسی طرح مدرسہ کے دوسرے پروگراموں میں بھی تعاون کریں۔ مدرسہ میں سارا تعلیمی کام نہیں کیا جاسکتا لہٰذا ضروری ہے کہ گھر میں بھی کچھ کام کیا جائے۔ اور اسے والدین بچوں سے کروائیں۔ اگر گھر میں روزانہ جھگڑا یا آئے دن مہمان آتے رہیں تو بچہ اچھی طرح سے سکول کا کام نہیں کر پائے گا۔

یہ روش اختیار نہیں کرنی چاہئے کہ بس مدرسہ میں ہی پڑھائی کا کام مکمل کیا جائے۔

بچوں کا دوسرے روز کا کام دیکھا جائے اور دوسرے روز واقع ہونے والے امتحان کے بارے میں سوال کیا جائے۔ اور امتحان کے لوازمات (قلم' پنسل' کاغذ' گتہ ----) تیار کرکے دیے جائیں۔

(سفر میں دیکھا جائے تو ایرانی حضرات ہی ہیں جو کئی کئی بیگ اور صندوق اور بکس بھر کر چل پڑتے ہیں ورنہ جو عبادت' علم' تفریح کے لئے مسافرت کو اختیار کرتے ہیں وہ تو صرف ایک ہینڈ بیگ پر ہی اکتفا کرلیتے ہیں۔)

والدین مختلف طریقوں سے مدرسہ کے ساتھ مربوط رہیں ان کے ذہن میں پڑھائی یا انتظامی امور کے سلسلہ میں جو اعتراضات یا رائے ہو اسے بیان کریں۔

اس بات کو فراموش نہ کریں کہ ---- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا مدرسہ علاقے کے مدرسوں میں اول نمبر پر آئے اور مستقبل میں اچھی پوزیشن دکھائے تو اپنے آپ کو بھی مدرسہ کا مسئول سمجھیں اور اس کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر ڈالیں۔

کس قدر بہترین وہ جملہ ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا ہے:

"من اصبح لا یهتم بامور المسلمین فلیس منهم ------ (بحار الانوار جلد ۷۴ ص ۳۳۹)

جو شخص اس طرح ہو کہ مسلمانوں کے امور میں اہتمام نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔

انسان گھر کے کاموں کو اپنے لئے مسئلہ سمجھتا ہے لیکن دین اور اجتماعی مسائل کو کوئی اہمیت نہیں دیتا گھر میں سفیدی اور چونا کرانے کی مسئولیت اپنے کندھوں پر سمجھتا ہے لیکن دین اور اجتماعات کو کسی خاطر میں نہیں لاتا اور ان کی بابت احساس ذمہ داری اور اہتمام نہیں کرتا۔

واقعاً" ہمیں سوتے وقت یا بیدار ہوتے وقت مسلمانوں کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہئے؟ اگر ہم ایک فیصد بھی خدا، مسائل اجتماعی، وظائف دینی کے بارے میں فکر کریں تو اپنے آپ کو مسلمان سمجھیں۔

دعا ہے کہ:

خداوند تعالیٰ ہم سب کو اپنے اور اپنے بچوں کے شرعی وظائف کو سمجھنے اور انہیں سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمیں اپنی مسئولیت جاننے کی توفیق دے تاکہ

ہم اجتماعی مسائل کو درک کر سکیں۔

ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے توفیق اور مدد طلب کریں۔

مسئلہ تعلیم و تربیت در اسلام

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے :

"قد افلح من تزکیٰ و ذکر اسم ربہ فصلیٰ" (سورہ اعلیٰ آیت ۱۴، ۱۵)

وہ یقیناً اپنی دلی مراد کو پہنچا جو (شرک سے) پاک ہوا۔ اور جو اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا اور نماز پڑھتا رہا۔

ہماری بحث کا موضوع ----- اسلام میں مسئلہ تعلیم و تربیت ہے اور تعلیم اور تربیت کے درمیان رابطہ ہے۔

قرآن مجید میں عموماً تربیت کو تزکیہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے ارشاد پروردگار ہے:

قد افلح من ذکھا و قد خاب من دسھا" (سورہ شمس آیت ۹، ۱۰)

جس نے اس جان کو (گناہ سے) پاک رکھا وہ تو کامیاب ہوا اور جس نے اسے گناہ کرکے دبا دیا وہ نامراد رہا ---- اسی طرح

قد افلح من تزکیٰ و ذکر اسم ربہ فصلیٰ۔"

یا جیسے سورہ جمعہ ----- جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض کو ذکر کیا گیا ہے۔

ھوالذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم ایاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ -------" (سورہ جمعہ آیت ۲)

وہ ذات جس نے امی لوگوں میں ایک رسول کو مبعوث کیا جس کا انہی کے ساتھ تعلق ہے وہ ان پر آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کی تربیت کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

بنا برایں ---- معلوم ہوگیا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر تربیت کے معنی

کے لئے لفظ تزکیہ کو بیان کیا گیا ہے۔

تزکیہ کا لغوی معنی اپنے آپ کو آلودگیوں سے پاک قرار دینا ہے زکوٰۃ اور تزکیہ ایک ہی مادہ سے ہیں۔ یعنی اگر تزکیہ کا معنی آلودگیوں سے پاک کرنا کیا جائے تو زکوٰۃ کا بھی یہی معنی کیا جائے گا۔

زکوٰۃ سے مراد مال کو دوسرے لوگوں کے حقوق سے پاک قرار دینا ہے اگر ایک مقدار مال نکال دی جائے تو باقی مال پاک ہو جاتا ہے ---- ہر قسم کے نفاق' کینہ اور بری نظر سے دور ہو جاتا ہے۔ اور اگر لوگوں کے حق کو مال سے ادا نہ کیا جائے تو یہ مال پاک نہ ہو گا بلکہ آلودہ ہو گا۔ اور طبعاً صاحب مال کے لئے اس میں برکت' پاکی' صفائی نہ ہوگی۔ اور جہاں تزکیہ روح' نفس' جان کے لئے استعمال ہوا ہے وہاں اس کا معنی ہو گا "روح اور فکر کو آلودگیوں سے بچانا"

یہ آلودگی کئی قسم کی ہے۔

فکری آلودگی' روحی آلودگی' اخلاقی آلودگی' ان سب سے محفوظ رہنا تزکیہ کہلاتا ہے۔

تعلیم سے پہلے تزکیہ

اس موضوع کے بارے میں چند ایک نکات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تزکیہ کا حکم پہلے بیان کیا ہے اور بعد میں تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ یعنی تربیت تعلیم سے پہلے ہوتی ہے۔ اس آیت مجیدہ کا عنوان خواص کی اس اصطلاح کے خلاف ہے جو کہتے ہیں تعلیم و تربیت۔ وہاں تعلیم پہلے اور تربیت کا بعد میں ذکر کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح فارسی زبان والوں کے درمیان رائج ہے۔ لیکن اسلام

میں تربیت پہلے اور تعلیم کا بعد میں ذکر کیا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں ایک وزارت ہے **(وزارة التربية و التعليم)** یہ بھی قرآن مجید کے مطابق تربیت کو مقدم قرار دیتے ہیں۔

یعنی پہلے روح، جان، اخلاق، اجتماع انحرافات اور آلودگیوں سے پاک ہو اور بعد میں اسے تعلیم دی جائے۔ تاکہ وہ کمال اور رشد کو حاصل کرے۔ لیکن اگر کسی کی روح گناہوں سے آلودہ ہو یا اس کی فکر آلودہ ہو تو اس صورت میں وہ رشد اور کمال کو حاصل نہیں کر سکتا۔

۲۔ رابطہ تزکیہ و تربیت

تزکیہ اور تربیت کے درمیان مقدمہ اور ذی المقدمہ جیسی مناسبت اور رابطہ ہے۔ تزکیہ کا معنی آلودگیوں سے پاک کرنا ہے۔ اور تربیت کا معنی انسان کو بلند کرنا، رشد دینا، اس کی نشو و نما کرنا ہے۔ تربیت "ربوہ" سے ہے جس کے معنی نشو و نما کے ہیں۔ یہ دونوں کے درمیان دقیق قسم کا ارتباط ہے۔ اور جب تک کسی شے کو اچھی طرح سے پاک نہ کیا جائے وہ بڑھنے اور رشد پانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں مثلاً:

۱۔ ایک کھیت یا باغ یا گلستان سے جب تک کسان یا مالی جڑی بوٹیوں اور گھاس وغیرہ کو تلف نہ کرے اس وقت تک درخت کے پتے، تنا، شاخیں مناسب نشوونما نہیں پاسکتیں۔ جس سے پیداوار اور پھل پھول متاثر ہوتے ہیں۔ اچھی اور زیادہ فصل لینے کے لئے ضروری ہے کہ جڑی بوٹیوں اور خود رو گھاس کو تلف کرکے فصل کے تنوں کو صاف رکھا جائے۔

۲۔ بعض ایسے درخت ہوتے ہیں کہ جب تک ان کی زائد (اضافی) شاخوں کو کاٹا نہ

جائے ان کے بڑھنے کا عمل رک جاتا ہے پس درختوں کا پہلے تزکیہ ہو پھر ان کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ پہلے کاٹی جانے والی شاخیں درخت کی نشو و نما کے لئے مقدمہ ہیں تاکہ اس درخت پر پھل اور پھول زیادہ اور بہتر ہوں۔

بنا بر این ----- تربیت کے لئے تزکیہ بہت زیادہ موثر اور لازمی اصول ہے اسی لئے اسلام نے تربیت کو تعلیم پر مقدم قرار دیا ہے یعنی:

جب تک دل آلودگیوں سے پاک نہ ہو اس وقت تک کمالات اور اخلاقی و معنوی فضائل کے لئے آمادگی نہیں ہو سکتی۔

۳۔ پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کا شعار

سب سے پہلا جملہ جو اسلام کی دعوت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دہن مبارک سے صادر ہوا وہ یہ تھا" "**قولوا لا الہ الا اللّٰہ تفلحوا**"

لا الہ الا اللہ کہو فلاح پا جاؤ گے۔

اسلام کا شعار بھی لا الہ الا اللہ ہی ہے۔ یعنی اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔

ایک لا الہ دوسرا الا اللہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے بنائے ہوئے خداؤں کی نفی کر دی تاکہ خدائے واحد و یکتا کو قبول کرنے کے لئے بنیاد فراہم ہو سکے۔ خواہ ان خداؤں کو لوگوں نے خود تراش کر بنایا تھا یا چلنے پھرنے والے مجسم خدا یا ستارے یا حیوانات یا ہوائے نفس یا درہم و دینار۔ جب تک کئی خداؤں کے پرستار موجود تھے توحید و یکتایت کی بابت دعوت نتیجہ بخش نہ تھی۔ للٰذا معاشرے کو بتوں کی آلودگی سے پاک کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب تک خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک نہیں کر لیا اور بتوں کو توڑ نہیں ڈالا، کسی قسم کی دعوت نہیں دی۔

آپؐ نے بے جان بتوں کو ہی نابود نہیں کیا بلکہ جاندار خداؤں کو بھی پاش پاش کر ڈالا۔ یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے باقی تمام خداؤں کا خاتمہ کر دیا۔

اور لوگوں کے درمیان اتحاد' یگانگت' برابری' مساوات' ہم آہنگی کو رواج دیا۔ چنانچہ ارشاد پروردگار ہے:

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم ------" (سورہ حجرات آیت ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں مذکر اور مونث سے پیدا کیا اور تمہارے شعبے اور قبیلے بنائے تاکہ تمہارا تعارف ہوسکے بے شک تم میں سے معزز تر وہی ہے جو زیادہ متقی و پرہیزگار ہے۔

بنا براین ------ آلودگیوں سے پاک ہونا کمالات کی طرف رشد کرنا ہے اور یہی اس کا حقیقی معنی ہے۔

ایک اور شاہد

اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک جملہ شاہد کے طور پر عرض ہے۔ آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں۔

۱۔ صفات ثبوتیہ۔' ۲۔ صفات سلبیہ (جو صفات اللہ تعالیٰ میں نہیں پائی جاتیں)

صفات سلبیہ اصل میں صفات نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ ایسی شے ہیں جو اللہ تعالیٰ میں پائی نہیں جاتی۔

خدا کا بیٹا نہیں ہے۔' خدا محتاج نہیں ہے' خدا مرکب نہیں ہے' خدا مادہ و جسم نہیں رکھتا' خدا زمان اور مکان سے مقید نہیں ہے۔' خدا کے لئے نیند اور غفلت نہیں

ہے۔

ان سب چیزوں کی اللہ تعالیٰ سے نفی کی گئی ہے۔

ان صفات سلبیہ کے مقابلے میں صفات ثبوتیہ ہیں۔ یہ صفات کمال ہیں مثلاً" اللہ تعالیٰ عالم ہے' اللہ تعالیٰ مرید ہے' اللہ تعالیٰ قادر ہے اور اس کی قدرت ہر شے پر محیط ہے' اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔

یہاں سب سے پہلے صفات سلبیہ کو یاد کیا جائے تاکہ باقی خداؤں کی نفی ہو سکے۔ یعنی جو لوگ خدا کو محتاج' اہل زمان اور اہل مکان اور اہل جسم سمجھتے ہیں اب جب صفات سلبیہ ثابت ہوں گی تو ان سب خداؤں کا انکار کرنا پڑے گا۔

جب کوئی خدا کے لئے جسم کو ثابت کرے تو وہ خیال کرے گا کہ خدا عرش پر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور کبھی خیال کرے گا کہ عرش پر نہیں ہے

البتہ!

یہ نہ کہیں کہ کیسے ہو سکتا ہے خدا ہزاروں سال پہلے سے موجود ہے؟ اصلاً" خدا کے ساتھ زمانے کی قید نہ لگائیں اس لئے کہ وہ زمان و مکان سے پاک ہے اور اللہ تعالیٰ ان کمالات کا حامل ہے مثلاً"

قدرت' علم' ارادہ' حیات

بنا بر این ----- عموماً" رشد اور تربیت اور بلندی درجات کے لئے پاک قرار دینا مقدمہ ہے۔

انسان کی خیر خواہی اور کمال طلبی میں تزکیہ کا اثر

ایک اصل جس کا قرآن مجید اور متعدد روایات سے استفادہ ہوتا ہے اور جو تربیتی

مسائل میں زیادہ مفید ہے ------ یہ ہے کہ :

انسان کی خلقت اس طرح سے ہوئی ہے کہ وہ اچھائی اور کمالات کا متمنی ہے۔ ان کا مبدا اپنے وجود اور ذات میں پاتا ہے۔ یعنی :

اللہ تعالیٰ نے انسان کو استعداد دی ہے جس کے ذریعے وہ کمال اور رشد کی طرف حرکت کرتا اور پرواز کرتا ہے چنانچہ اسی نظریہ کے ضمن میں ارشاد پروردگار ہے :

"**ونفس وما سویها فالهمها فجورها و تقوها**" (سورہ شمس آیت ۷، ۸)

نفس کی قسم اور اس کی جس نے اسے پیدا کیا۔ پس اسے برائی اور نیکی کا الہام کیا۔

یعنی:

انسان خود بخود برائی اور نیکی میں تمیز کر سکتا ہے اور یہ بصیرت، روشنی، درایت اور بینش اس کی کنہ ذات میں قرار دی گئی ہے لیکن ان سب کا تعلق دل کے آئینہ کے ساتھ ہے اور اس آئینہ پر چند چیزوں کی وجہ سے گرد پڑ جاتی ہے جس سے انسان کی روح اور جان رشد و کمال کو حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ چیزیں یہ ہیں :

غلط تربیت، خرافات، افسانے، شہوات (یہ سب روح کے رشد کرنے میں رکاوٹ ہیں)

چنانچہ ضروری ہے کہ اس گرد اور آلودگی کو دل کے محیط اور صفحہ روح سے پاک اور صاف کر دیا جائے۔ اس صورت کے بغیر تعلیم و تربیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا مثلاً"

اگر کوئی شخص کافی معلومات رکھتا ہو لیکن اس کی اخلاقی تربیت نہ ہوئی ہو۔ اور اس کی روح آلودگیوں سے پاک نہ ہو --- تو کیا یہ معلومات اسے کوئی فائدہ دے

سکیں گی؟

اور اگر روحانی لحاظ سے اپنے اخلاق کو آلودگیوں سے پاک کیا ہوا ہو تو وہ اپنے اختیارات والے سرمایہ سے بہرہ مند ہو سکتا ہے اور بہتر نتائج مرتب کر سکتا ہے۔

معاشرے میں فسادات کا اثر

یہاں ہم مختصراً ------ بحث کا نتیجہ نکالتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ جو اخلاقی اور فکری فسادات معاشرے میں پیدا ہو چکے ہیں یہ سب کے سب لوگوں کے کمال اور رشد کے لئے رکاوٹ ہیں۔ مثلاً

نشہ ایک اخلاقی اور اجتماعی برائی ہے۔

اس کا نقصان صرف یہ نہیں ہے کہ پینے والا دولت' وقت' صحت' طاقت اور سلامتی کو تباہ کرتا ہے اور اپنی جان کو ضرر و نقصان میں ڈالتا ہے اور اپنے نفس کو آلودہ کرتا ہے بلکہ یہ معاشرے کی ترقی اور توانائی اور رشد میں بھی رکاوٹ بنتا ہے۔

ایسا کرنے سے معاشرے کے ایک فرد کی روح' عقل' علمی و فکری قدرت کمزور ہو جاتی ہے جس سے معاشرے کی پیشرفت نہ صرف رک جاتی ہے بلکہ معاشرے کی سطح نیچے آجاتی ہے۔

لہٰذا انسان کی تربیت اور رشد میں فساد بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

جھوٹ ایک آفت ہے

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اخلاق کے لئے جھوٹ ایک آفت ہے اور یہ ایک قسم کا فساد بھی ہے۔ اس لئے کہ جھوٹ بولنا ایک بری عادت ہے۔ جب کسی فرد یا معاشرے میں جھوٹ کی عادت پڑ جائے تو اس معاشرے کی طاقت سے استفادہ ممکن

نہیں رہتا۔

یعنی جب ایک گروہ جھوٹ بولنے والوں کا ہو تو ان کی ہر بات پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے جس سے لوگوں کے کاموں میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً" اگر بازار کے معاملات میں جھوٹ بولا جانا شروع ہو جائے تو بازار کی بہت بڑی طاقت اس کے خاتمہ میں لگ جائے گی۔

یعنی:

ایک چھوٹا سا قالین خریدنے کے لئے صرف دس منٹ کی ضرورت ہے لیکن جھوٹے دکانداروں کی وجہ سے شاید دو گھنٹے صرف ہو جائیں۔ تاکہ اس کی صحیح قیمت معلوم کرکے خریدا جائے۔

بنا براین ---- جھوٹ کی وجہ سے رشد میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

جس سے اکثر دکانداروں کی محنت ضائع ہو جاتی ہے سو لوگ آئیں گے اور چیزوں کا نرخ دریافت کرکے چلے جائیں گے۔ دکانداروں کا اعتماد ختم ہو جائے گا۔

جس طرح مالی درختوں کی اضافی شاخوں کو نہ کاٹے تو درخت کی نشو و نما متاثر ہوتی ہے اور اس سے صحیح طور پر فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

پس ! اس آفت اور مصیبت کی وجہ سے رشد میں رکاوٹ اور طاقت ضائع اور تربیت بے اثر ہو جاتی ہے۔

نیز!

گناہ اور فساد اگر معاشرے میں پیدا ہو جائے تو وہ اس کی تربیت اور رشد کے لئے مصیبت اور آفت ہوتے ہیں۔

بنابراین ---- تزکیہ تربیت کی بنیاد بلکہ تزکیہ ہی تربیت ہے۔

نوجوانوں کی پسماندگی میں فسادات کا اثر

مسائل اجتماعی کہ جنہیں بیان کیا جا رہا ہے ---- میں فسادات کے مراکز کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ ان فسادات کے مراکز کہاں ہیں- ان کے لئے کچھ سرمایہ اور وقت صرف ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں کئی تعلیمی کام پیچھے رہ جاتے ہیں۔

یعنی وہ جوان جسے اپنی ذمہ داری انجام دینی چاہیئے اسے فساد کے مرکز پر پہنچا دیا جاتا ہے جس سے اس کے اخلاق میں فساد بپا ہو جاتا ہے نتیجتاً اس کی فکر اور ذہن شہوات اور جنایات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

یعنی کچھ دیر وقت تلف کرنے کے بعد نہ یہ کہ وہ اپنی تعلیم کا وقت ضائع کر بیٹھتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی روح کو بھی پریشان کر دیتا ہے جس سے اس کی توجہ اور تعلیم بری طرح سے متاثر ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

اب ریاضی، فزکس، ہندسہ، الجبرا کے مسائل سے رغبت اٹھ جاتی ہے کیونکہ اب تو اس کی تمام دلچسپیاں کسی اور طرف لگی ہوئی ہیں۔ جس نے اس کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر کے اسے اپنی طرف جذب کیا ہوا ہے۔

یعنی:

ایک معاشرہ میں جس قدر فساد کے مراکز زیادہ ہوں گے اسی قدر افراد کی فکر، خواہشات نفسانیہ اور اخلاق فاسد ہوں گے ---- اور انکی چاہت زیادہ ہوگی تو علمی و اجتماعی پیشرفت اور فکری ترقی کم ہو جائے گی۔

(شہید باہنر کی یہ تقریر انقلاب اسلامی کی کامیابی سے پہلے کی ہے ورنہ اب تو یہاں اسلامی حکومت اور نظام قائم ہے۔)

اخلاقی فسادات کی تخریب کاریوں کا اثر صنعتی ترقی یافتہ ممالک میں

ممکن ہے کہ بعض احباب کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہو:

کیا وجہ ہے کہ یورپی ممالک اور دوسرے ممالک جن میں اخلاقی آلودگی یا اجتماعی فساد بہت زیادہ ہیں' نے علمی و صنعتی ترقی کی ہے؟

کیا یہ اخلاقی فسادات' ان کی علمی ترقی کے ساتھ مزاحم اور منافی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ تیسری دنیا اور ہمارے معاشرہ کے اشتباہات میں سے ایک اشتباہ یہی مسئلہ ہے۔

جب یہ لوگ میزائل ----- چاند کی تسخیر---- بڑے بڑے کارخانے اور دل کے آپریشن جیسی ترقیاں دیکھتے ہیں اوران کے ساتھ ساتھ مراکز فساد و فحشا کو بھی ملاحظہ کرتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں (ترقی و فساد) آپس میں ربط رکھتے ہیں یا کم از کم آپس میں منافات نہیں رکھتے۔

یعنی:

اگر ایک معاشرہ ترقی کی منازل طے کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان فسادات اخلاقی کو بھی رکھتا ہو۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اصلح انتخاب کی بجائے افسد انتخاب کیا ہے۔

یعنی:

ترقی پذیر معاشرہ جس وقت ان کی پیروی کرے تو انہیں اس آیت کا مصداق بننا چاہئے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

(----**فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ**" (زمر/۱۷'۱۸)

خوشخبری دے دوان بندوں کو جو بات سنتے ہیں اور اس میں سے اچھی کی اتباع کرتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک کو چاہئے کہ یورپی ممالک کی باتوں کو سنیں اور ان میں سے مفید اور بہتر کو لے لیں اور ان پر عمل کریں۔ یعنی وہ شے جس سے شہوات اور خواہشات نفسانی کو سیرابی حاصل ہوتی ہے اسے چھوڑ دے اور جو بہتر ہیں انہیں لے لے۔

یعنی:

ان کی اصل کے خلاف رہیں۔ تربیت اسلامی کے مطابق چاہئے کہ ان کا دل' کان' آنکھ دوسروں کی چیزوں کے مقابلے میں کھلی ہوئی ہوں اور ان کی باتوں میں سے بہتر اور مفید کو لے کر اس پر عمل کریں۔

البتہ!

میرا خیال ہے کہ اس قسم کے معاشروں میں عمدہ چیزوں کو بھی مدنظر رکھا جائے جو مسائل کے خلاف ہیں جو علمی اور عظیم پیش رفت میں مانع ہیں اس پر زیادہ اعتماد کیا جائے اور اس کی ترویج کی جائے۔

ترقی پذیر ماحول میں علمی پیش رفت بہت زیادہ مطلوب اور قابل تحسین شمار کی جاتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود ان مفاسد کو آفت اور مصیبت خیال کرتے ہیں۔

یعنی:

جب معاشرہ میں فحاشی زیادہ ہوگی' ناجائز بچے ضائع کرائے جائیں گے' غیر شرعی

(البتہ یہ جو قابل تحسین کہا ہے۔ یہ جملہ میری نظر میں آیا ہے کہ ہم فقط تحسین اور تعجب کرتے ہیں بلکہ ہمارے لئے آفرین کہنا چاہئے اور کس حد تک ہم ان کے ساتھ شریک ہیں اور کتنی محنت کی جائے تاکہ اسلام کی ترقی کے افق تک پہنچ سکیں' اور ہم خود قافلہ سالار' پیشرو اور سرمشق بن جائیں؟

مراسم پھیلائی جائیں گی، طلاق وغیرہ زیادہ ہوں گی تو وہ معاشرہ کی تباہی کے لئے آفت ہوگی جسے وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اور اس بابت وہ کہتے ہیں! ہمارا معاشرہ خطرناک عادتوں، ان مفاسد، ان فحشا اور طلاق کی کثرت کی بنا پر ---- کہاں جا رہا ہے؟ اس مسئلہ کو ایک درد کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

البتہ!

رواں شناس، علمائے تربیتی، جامع شناس جو ان فسادات کے بارے میں کسی حد تک معلومات رکھتے ہیں اور ان میں منفعت نہیں رکھتے، اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جو مفاد پرست، دولت کے پجاری اور دولت اکٹھی کرنے کے لئے مختلف راہوں پر گامزن ہیں۔ یہی لوگ جنسی تمایلات پر دوسروں کو آمادہ کرتے ہیں اور فسادات کی ترویج سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

رسالت کے اہداف میں سے ایک

آپ خیال کریں کہ ایک معاشرہ کس قدر خلقت اور طبیعت کے اعتبار سے فکری رشد رکھتا ہے؟ بہت زیادہ۔ وہ چاہتا ہے کہ آزاد سوچے اور آزاد فکر کرے اور مختلف علمی، فکری، اجتماعی اور معنوی لحاظ سے ترقی کرے۔ لیکن جب وہ اپنی آزاد فکر کے ساتھ پیش قدمی کرتا ہے تو آفات اور موانع دامن گیر ہو جاتی ہیں اور وہ روحانی سرمایہ سے فیض حاصل نہیں کر سکتا۔ اور آفات اس معاشرے کی پسماندگی کا سبب بن جاتی ہیں۔ لہٰذا ایک تعبیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے بارے میں قرآن مجید نے بیان کی ہے یہ ہے کہ:

"----ویضع عنھم اصرھم والا غلال التی کانت علیھم -----"

(سورہ اعراف آیت ۱۵۷)

اس نے ان کے کندھوں سے بوجھ اٹھا لیا ہے اور زنجیروں کو توڑ ڈالا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کے اہداف اور مقاصد میں سے ایک یہ تھا کہ وہ انسانی معاشرہ کے کندھوں سے بھاری بوجھ اتار دیں۔ اور جو زنجیریں لوگوں کے پاؤں میں ڈالی گئی تھیں انہیں توڑ ڈالیں۔

اگر ایک معمولی انسان پندرہ منٹ میں ایک کلو میٹر فاصلہ طے کر سکتا ہو۔ یا دوڑ لگا کر سات منٹ میں ایک کلو میٹر فاصلہ طے کر سکتا ہو اب اگر اسی شخص کے پاؤں میں زنجیریں اور بیڑیاں ڈال دی جائیں تو وہ اپنی رفتار کو کھو بیٹھے گا اور اس مدت میں فاصلہ طے نہیں کر سکے گا۔ اب ضروری ہے کہ ان زنجیروں اور بیٹریوں کو توڑ دیا جائے تاکہ اس کی رفتار صحیح و سالم رہے۔ اسلام کا یہی ہدف ہے کہ وہ زنجیروں اور بیڑیوں کو توڑ ڈالے۔ اور زنجیریں جو یہودیوں اور عیسائیوں نے لوگوں کی سوچ پر ڈال رکھی تھیں اور کلیسا والوں نے لوگوں کے ہاتھ' پاؤں باندھ دیئے تھے۔ اب اسلام نے لوگوں کی فکر پر چھایا ہوا اجتماعی' اقتصادی' اخلاقی بوجھ اٹھا لیا تاکہ انسان آزاد ہو جائے اور آرام و راحت محسوس کرے اور نتیجتاً اس کی تربیت ہو جائے اور رشد پیدا کر کے بلندیوں کے زینوں پر قدم رکھے۔

نئی چیزیں جنہیں اسلام نے بیان کیا ہے

لوگوں کے پاؤں سے زنجیروں اور بیڑیوں کا اتار پھینکنا بھی ان نئی چیزوں میں سے ہے جنہیں اسلام نے بیان کیا ہے۔

اسلام کیا لایا؟ یہ خود ایک بحث ہے۔

اسلام جن چیزوں کو لایا ہے وہ کیا تھیں؟

اسلام کا ایک وظیفہ یہ تھا کہ معاشرے میں پہلے لوگوں کی پھیلائی ہوئی ناہمواری' ناگواری' خرافات' کج فکری' کج روی کو ختم کر کے انسان کو تمام آلودگیوں سے پاک کیا جائے یہ کہنا معمولی سی بات ہے کہ اے انسان! جس خدا کا تو تصور رکھتا ہے وہ حقیقی خدا نہیں ہے وہ اہمیت جو تو کلیسا کے رہبروں یا اجتماعی کامداروں' رہبروں اور سرمایہ داروں کو دیتا تھا وہ درست نہ تھی۔

اس کی فکر کو ان آلودگیوں سے پاک کیا جائے تاکہ معاشرہ آزاد ہو اور جب اس کی فکر آزاد ہوگی تو وہ پرندوں کی طرح بلندیوں کی طرف پرواز کرنے لگے گا۔ لیکن وہ جس پنجرہ میں بند ہے اسے کھول دیا جائے ------ اور دیکھا جائے کہ وہ کتنی پرواز کرتا ہے۔ اسلام کی خدمات میں سے ایک بہت بڑی خدمت اس پنجرہ کے دروازہ کا کھولنا ہے وہ پنجرہ جو آئندہ نسلوں اور معاشرہ کی روح اور جان کو قید کرنے کے لئے بنایا گیا ہے اسے کھول دیا جائے اور جن زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے انہیں توڑ دیا جائے تو نتیجتاً آزاد انسان بلندیوں کی طرف پرواز کرے گا۔

جھوٹ' حسد' کینہ' نفاق' بدبینی اور بے اعتمادی ----- سب زنجیریں ہیں کہ جن میں ایک معاشرہ گرفتار ہے اور یہ اس کی آزادی' رشد' ترقی اور پیش رفت میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

"----**ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ** -----" (سورہ جمعہ آیت ۲)

(البتہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مباحث کو مخلوط کر رہا ہوں۔ صرف ان مباحث کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کیونکہ ان تمام کا آپس میں باہمی ربط ہے۔)

یعنی پہلے تو پیغمبر اکرمؐ لوگوں کا تذکیہ کرتے اور پھر نہیں تعلیم و تربیت سے بہرہ یاب کرتے۔ اس صورت کے علاوہ ایک آلودگی کے شکار ماحول میں اچھی خوراک تیار بھی ہو تو یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ وہ اچھی خوراک فاسد اور خراب خوراکوں کے مقابلے میں اپنا کام کر سکے اس بنیاد پر تربیت کے مسئلے میں ضروری ہے کہ ایک خاص جہت پر توجہ دی جائے اور اس پر انحصار کیا جائے۔ یہ جہت اجتماعی اور اخلاقی خرابیوں اور ان سے پیدا ہونے والی صورتوں سے جنگ آزمائی ہے۔

نوجوانوں کی تربیت میں حساس اثر

یہ بات طالب علموں اور جوانوں سے خاص طور پر تعلق رکھتی ہے جو زندگی کے ابتدائی ایام میں گمشدہ چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اور ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسی شے حاصل کریں جس کی بناء پر انہیں سرگرمی حاصل ہو اور ان کا دل دھڑکے اس حالت میں ان کے ہاں فراواں جوش، کوشش اور تلاش اس نادیدہ شے کے پیچھے سرگرداں ہو اس وقت کتنی جلدی وہ اجتماعی خرابیوں کے خطرناک جال میں پھنس سکتے ہیں اور یہ خرابیاں اس کو اپنے چنگل میں گرفتار کر دیتی ہیں اور یوں اسے ہر قسم کی ترقی سے باز رکھتی ہیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ ان تمام آلودگیوں اور ان تمام خرابیوں کے بارے میں سوچا جائے جو جوانوں کی راہ میں پیدا ہو جاتی ہیں تاکہ یہ جوان ان کے جال میں نہ پھنسیں۔ اپنے آپ کو ان خرابیوں سے آلودہ نہ کریں اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنی تمام تر طاقتوں اور کوششوں کو ایک ایسی سرگرمی کی راہ میں صرف کریں۔ جو درست ہو۔ ترقی کا راستہ دکھائے کمال تک پہنچائے اور بلندیوں سے آشنا کرے۔

خداوند عالم انشا اللہ ہم سب کو تربیت و تعلیم کو قبول کرنے کی طاقت عطا

فرمائے۔ خداوند عالم انشاء اللہ ہم سب کو اسلام کے اصلی معارف سے آشنا کرے اور معاشرے کے فتنہ و فساد کی جڑوں کو قطع کرے۔ انشا اللہ خداوند عالم ہم سب کو یہ توفیق دے کہ ہم کمال اور ترقی کو حاصل کرپائیں۔

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ علی محمد وآلہ الطاہرینؑ

نکلے از مطبوعات امامیہ پبلی کیشنز

مصائبِ زہرا (س)

صدرِ اسلام کی جن خواتین کے نام زبان زدِ عام ہیں اور جن کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اِن میں بلا مُبالغہ جناب سیدہ (س) کا نام نامی آتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے اپنی مثنوی میں جنابِ سیدہ (س) کو عورتوں کے لیے اُسوۂ کامل قرار دیا ہے۔ وہ بیٹی بھی ہیں، ماں بھی ہیں اور بیوی بھی۔ عورت کی یہ تینوں حیثیتیں معاشرے کو تقویت دینے کے لیے ضروری ہیں۔ جناب سیدہ (س) ان تینوں حیثیتوں سے گمراہی کے سیلاب میں ڈگمگانے والی ہر عورت کے لیے روشنی کا مینار ہیں اور ان کے سامنے یہ حقیقت رکھتی ہے کہ عورت صِرف ماں بیٹی اور بیوی ہی نہیں بلکہ وہ معاشرے کی ایک ذمہ دار فرد بھی ہے اور معاشرے کو قوّت دینے کے لیے اس کا ایک کردار بھی۔ جنابِ سیدہ (س) کی زندگی پر بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں شائع ہوتی ہیں۔ جناب محمّد دشتی نے "مصائبِ زہرا" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اُن مصائب کا ذکر کیا ہے جو اپنی مختصر زندگی کے آخری ایّام میں اُن پر وارد ہوئے۔ کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جناب سیدہ (س) نے کس طرح ہمّت اور حوصلے سے ان مصائب کو برداشت کیا اور اسلامی معاشرے کی بقا کی خاطر ان مصائب کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ یہ کتاب جناب سیدہ (س) کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہے اور ہمیں راہِ ہدایت بھی دکھاتی ہے اور غیرت کا سامان بھی مہیّا کرتی ہے۔ جو صِرف عورتوں کے لیے ہی نہیں بلکہ مردوں کے لیے بھی سبق دیتی ہے کہ کس طرح مصائب کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور ان کے سامنے اپنے حواس کو اپنے اجتماعی فریضے کو اور معاشرے میں اپنے مخصوص کردار کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

صفحات: ۱۸۴
قیمت: ۴۰/-

امامیہ پبلی کیشنز پاکستان

نوجوان کیا کریں؟

حجۃ الاسلام تقی فلسفی ایران کے شہرہ آفاق خطیب ہیں، ان کی خطابت میں آگ کی گرمی بھی ہے اور شہد کی شیرینی بھی۔ خطابت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اقوالِ معصومینؑ کو سامنے رکھ کر بچوں اور جوانوں کی تربیت کے بارے میں چند کتابیں مرتب کیں۔ "نوجوان کیا کریں؟" کے خلاصے کا ترجمہ مولانا محمد رضا غفاری نے فرمایا ہے اور اس میں معصومینؑ کے اقوال کو اردو میں پیش کیا ہے، جس سے اِن مسائل پر روشنی پڑتی ہے جو نوجوانوں کو عام طور پر پیش آتے ہیں۔ اگر انھیں کوئی صحیح راستہ دکھانے والا نہ ہو تو ان کا گمراہ ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اِس کتاب میں آقائے تقی فلسفی نے اُن بے شمار مسائل کے بارے میں اقوالِ معصومینؑ جمع کیے ہیں جن مسائل سے ہر نوجوان دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اس کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ کتاب والدین اور ان کے نوجوان بیٹے اور بیٹیوں کے لیے روشنی کا منبع ہے۔ اگر اِس روشنی سے اقتباس کرلیں تو دِین و دُنیا کی بھلائی ان کے حصے میں آسکتی ہے۔

امامیہ پبلی کیشنز پاکستان

نوجوانوں کے جنسی مسائل

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو صرف آخرت کی طرف متوجہ نہیں کرتا بلکہ دُنیا و آخرت دونوں میں اسلامی رَوِش اِختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔
ہماری دُنیاوی زندگی میں جہاں اِنسان کی اور ضرورتیں ہیں وہاں اس کے جنسی تقاضوں کو درست طریقے پر پورا کرنا بھی شامل ہے۔ غیر اسلامی معاشروں سے جو ہمارے ہاں تصوّرات آگئے ہیں، ان میں ایک جنس کا مسئلہ بھی ہے۔ کہ بعض معاشروں میں اسے بہت بُری چیز گردانا گیا ہے اور بعض نے اسے ایک فالتو بات سمجھا ہے۔ لیکن نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ جنسی اِشتہا کو پُورا کرنا بھی اُسی طرح ضروری ہے جس طرح پیٹ کی بھوک اور اگر اسے صحیح طریقے سے پُورا نہ کیا جائے تو اِنسان کے ذہن کا وُہی حشر ہوتا ہے جو اُس شخص کے معدے کا جو یا تو بہت کم کھائے یا اتنا زیادہ کھالے کہ خُود بھی مصیبت میں پڑے اور دُوسروں کو بھی مصیبت میں ڈالے۔
مگر افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ہاں لکھنے والوں نے اس کی طرف بہت کم توجّہ دی ہے۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں جنسی معاملات اپنے ان ساتھیوں سے حاصل کرتے ہیں جو اُن سے عُمر میں ذرا بڑے ہوں لیکن ناتجربہ کاری کی بنا پر غلط تصوّرات اپنے ذہنوں میں قائم کر لیتے ہیں اور دُوسروں کو بھی خراب کرتے ہیں۔

"نوجوانوں کے جنسی مسائل" ڈاکٹر علی قائمی نے فارسی میں تحریر کی اور کوثر عباس حیدری نے اسے اُردو کا لباس پہنایا اور یہ کوشش کی ہے کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ان مسائل کو کیونکر حل کیا جائے جو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے سامنے دیکھتے ہیں لیکن ان کی راھنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

امامیہ پبلیکیشنز پاکستان

حاصلِ مُطالعہ

مجالسِ امام حسینؑ

مصنف: مولانا محمد حسین لکھنوی

مجالسِ عزائے حسینؑ تعلیمات محمدؐ و آلِ محمدؐ کے نشر کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ مولانا لکھنوی نے اس کتاب میں ۱۹ مجالس پیش کی ہیں۔ پڑھنے والوں کو تو ان مجالس سے حقائق کا علم حاصل ہوگا ہی، جو حضرات مجالس پڑھنے کے شغل سے وابستہ ہونا چاہتے ہوں اُن کیلئے بھی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

صفحات: ۵۱۶

باغِ فدک

مصنف: مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید

فدک کا مسئلہ ان اہم مسائل میں سے ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کی صفوں میں بہت سا انتشار پیدا ہوا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑے مُدلّل انداز میں بحث کر کے حقیقت کو واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ فدک جناب سیدہؑ کا حق تھا جس سے اُنھیں محروم کر دیا گیا۔

صفحات: ۱۲۸

نائبینِ امامؑ

تحریر: عباس راسخی نجفی

مترجم: سیّد افسر عبّاس زیدی

حضرت حجّت ابن الحسنؑ کی غیبتِ صُغریٰ کے زمانے میں آپؑ کے چار نائبین نے امامؑ اور مومنین کے درمیان رابطے کا کام کیا۔ اس کتاب میں ان نائبین کے حالاتِ زندگی اور ان کی کارکردگی سے بحث کی گئی ہے بہت معلومات افزا کتاب ہے۔

صفحات: ۲۵۴

استعمار اور اسکی سازشیں

تحریر: آیۃ اللہ سیّد حسن ابطحی

ترجمہ: مولانا سیّد علی الموسوی

اسلام کے خلاف مختلف اَدوار میں اور خصوصاً اس دَور میں بہت سی سازشیں ہوئی ہیں۔ فاضل مصنّف نے اس قسم کی ۲۵ سازشوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ مسلمانوں کیلئے بڑی روشنی کا سامان ہوگا اور وہ استعمار کی سازشوں سے آگاہ ہوسکیں گے۔ صفحات: ۱۱۰

امامیہ پبلیکیشنز پاکستان

حاصلِ مُطالعہ

باغِ فدک

مصنف: مولانا سیّد محمد جعفر زیدی شہید

فدک کا مسئلہ ان اہم مسائل میں سے ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کی صفوں میں بہت سا انتشار پیدا ہوا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بڑے مُدلّل انداز میں بحث کر کے حقیقت کو واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ فدک جناب سیّدہؑ کا حق تھا جس سے اُنھیں محروم کر دیا گیا۔ صفحات: ۱۲۸

انقلابِ مہدیؑ

مصنف: آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

مترجم: سیّد محمد عسکری

اس کتاب میں فاضل مصنف نے امام آخر الزمانؑ کے وجودِ ذی جود، آپؑ کی غیبت اور فلسفۂ انتظار سے بڑی مُدلّل بحث کی ہے۔ یہ بحث عامۃ المسلمین اور خاص طور پر مومنین کیلئے بہت معلومات افزا ہے

صفحات: ۳۱۸

نائبینِ امامؑ

تحریر: عباس راسخی نجفی

مترجم: سیّد افسر عبّاس زیدی

حضرت حجت ابن الحسنؑ کی غیبتِ صُغریٰ کے زمانے میں آپؑ کے چار نائبین نے امامؑ اور مومنین کے درمیان رابطے کا کام کیا۔ اس کتاب میں ان نائبین کے حالاتِ زندگی اور ان کی کارکردگی سے بحث کی گئی ہے بہت معلومات افزا کتاب ہے۔ صفحات: ۲۵۴

منبعِ عدل

مصنف: آیت اللہ ابراہیم امینی

مترجم: مولانا سیّد افسر عباس زیدی

یہ کتاب بہت اہم موضوع سے متعلق ہے جس میں امامِ عصرؑ کی طولِ عُمر اور علاماتِ ظہور کے بارے میں نہایت دلچسپ مقالے کی صورت میں بحث کی گئی ہے۔ مومنینِ کرام کے لیے یہ کتاب تازگیٔ ایمان کے لیے ضروری ہے۔ صفحات: ۴۱۲

امامیہ پبلیکیشنز پاکستان

نوجوانوں کے جنسی مسائل

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو صرف آخرت کی طرف متوجہ نہیں کرتا بلکہ دُنیا و آخرت دونوں میں اسلامی رَوِش اِختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ ہماری دنیاوی زندگی میں جہاں اِنسان کی اُور ضرورتیں ہیں وہاں اس کے جِنسی تقاضوں کو درست طریقے پر پورا کرنا بھی شامل ہے۔ غیر اسلامی معاشروں سے جو ہمارے ہاں تصوّرات آگئے ہیں ان میں ایک جنس کا مسئلہ بھی ہے۔ کہ بعض معاشروں میں اسے بہت بُری چیز گردانا گیا ہے اور بعض نے اسے ایک فالتو بات سمجھا ہے۔ لیکن نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ جِنسی اِشتہا کو پُورا کرنا بھی اُسی طرح ضروری ہے جس طرح پیٹ کی بھوک اور اگر اسے صحیح طریقے سے پُورا نہ کیا جائے تو اِنسان کے ذہن کا وُہی حشر ہوتا ہے جو اُس شخص کے معدے کا جو یا تو بہت کم کھائے یا اتنا زیادہ کھالے کہ خُود بھی مصیبت میں پڑے اور دُوسروں کو بھی مصیبت میں ڈالے۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ہاں لکھنے والوں نے اس کی طرف بہت کم توجّہ دی ہے۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں جنسی معاملات اپنے ان ساتھیوں سے حاصل کرتے ہیں جو اُن سے عُمر میں ذرا بڑے ہوں لیکن ناتجربہ کاری کی بنا پر غلط تصوّرات اپنے ذہنوں میں قائم کر لیتے ہیں اور دُوسروں کو بھی خراب کرتے ہیں۔

"نوجوانوں کے جنسی مسائل" ڈاکٹر علی قائمی نے فارسی میں تحریر کی اور کوثر عباس حیدری نے اسے اُردو کا لباس پہنایا اور یہ کوشش کی ہے کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے ان مسائل کو کیونکہ حل کیا جائے جو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے سامنے دیکھتے ہیں لیکن ان کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔